جلد ۸۴   اکتوبر ۱۹۷۵ء   عدد ۴

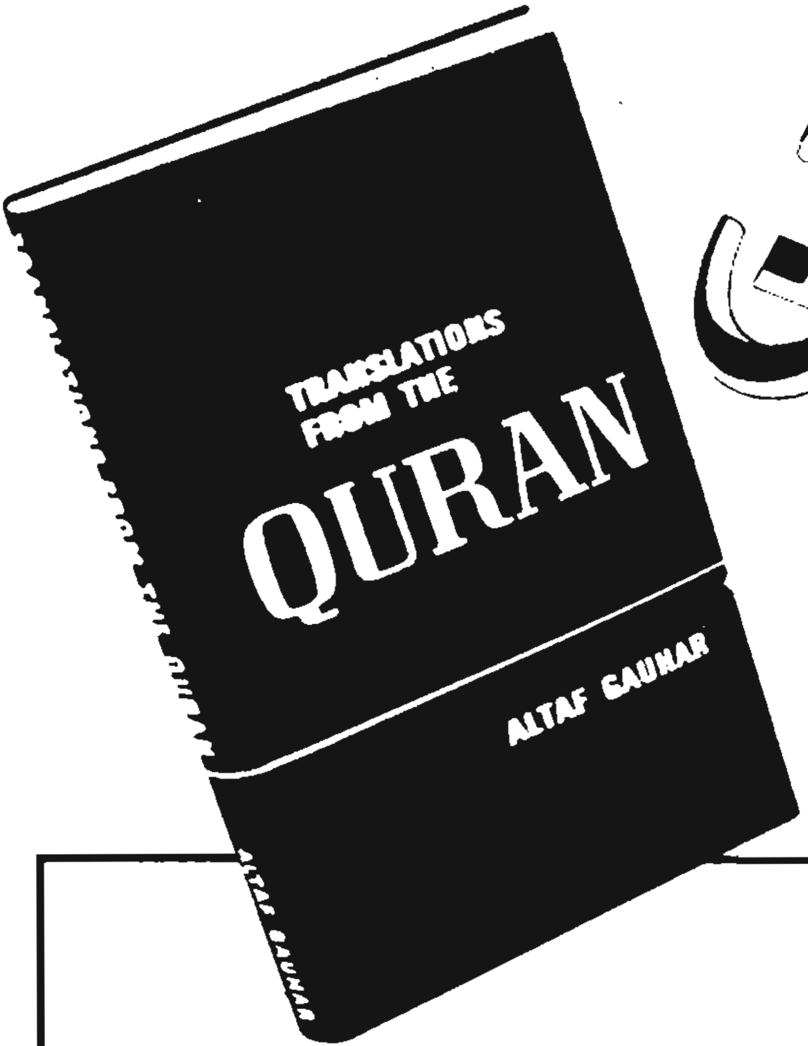
ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور



مقام قرآن

(انگلش ایڈیشن)

مصنّف :

الطاف گوہر

وہ ولولہ انگیز اور عہد آفریں کتاب جس نے نوجوان طبقہ میں قرآن کریم کے براہِ راست مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔

سادہ اور پُرخلوص تراجم، دقیق مسائل کا دلنشیں بیان، ہر جملہ اپنے دامن میں ایک تجربہ لئے ہوئے ہے،

مغربی تہذیب کی دورخی، سیکولر معاشرے کا زوال، ایک تاریخی محاسبہ،

یہ کتاب آپ کے دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے گی

دوسرا ایڈیشن   قیمت : ۲۵ روپے

پبلشرز : ادارہ ترجمان القرآن ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور ٹیلی فون 57706

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اکتوبر ۱۹۷۵ء مطابق رمضان ۱۳۹۵ھ	جلد ۸۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کسی نظریہ کی صحت کو عام طور پر دو طریقوں سے جانچا جاتا ہے۔ عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر یا اس کے عملی نتائج دیکھ کر۔ انسانی تجربات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اکثر و بیشتر صحیح نظریہ استدلال اور نتائج دونوں اعتبار سے انسان کے لیے اطمینان کا باعث ثابت ہوتا ہے لیکن دنیا میں ایسے نظریات کی بھی کمی نہیں جو عقل و استدلال کے نقطۂ نظر سے اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں لیکن جب وہ عملی زندگی کے سانچوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں تو اتنے بھیانک معلوم ہوتے ہیں کہ انسان انہیں دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اسی طرح بعض نظریات ایسے بھی ہیں جنہیں عقل کے نمائشی پرستار پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن جب وہ پیکر محسوس میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو انسانوں کی اکثریت ان کی صحت اور عظمت کی قائل ہو جاتی ہے۔ ہم ان تینوں اقسام کے نظریات کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ آپ نظریۂ توحید پر غور کریں۔ اس میں عقل و استدلال کے اعتبار سے بھی بڑی کشش اور جاذبیت ہے اور انسانی قلب و دماغ کو اس نظریہ کے اپنانے سے سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پھر جس معاشرے نے بھی اس بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کی ہے اس کے سارے مسائل بطریق احسن حل ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس معاشرے کے اپنے ارکان اور باہر سے مشاہدہ کرنے والے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں کہ اگر جنتِ ارضی کہیں موجود ہو سکتی ہے تو وہ یہی خطّہ ہے، جس میں توحید اور رسالت کو رہنما اصول مان کر اس کے مطابق زندگی کی تشکیل کی گئی ہے۔

نظریات کی دوسری قسم یعنی جو اپنے اندر بظاہر بڑی جاذبیت رکھتے ہیں مگر عملی میدان میں انسانیت کو تباہ و برباد کرتے ہیں، مادی تہذیب کے افکار و تصورات میں بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً پیدائش دولت اور صرف دولت کی آزادی۔ بادی النظر میں تو یہ اُصول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معیشت پر کسی قسم کی پابندی

عائد نہ کی جائے۔ ایک انسان اپنی ذہانت اور فطانت کے بل بوتے پر جس طرح چاہے اور جس قدر چاہے کمائے اور اپنی اس دولت کو جس انداز پر چاہے خرچ کرے اور کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ نظریہ کی حد تک تو اس میں کافی حد تک کشش نظر آتی ہے۔ کیونکہ آزاد معیشت بھی انسانی آزادی کے پیدائشی حق کا ایک لازمی حصہ ہی ہے۔ جب انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی دائرے میں بھی اس پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے۔ چنانچہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد اسی اصول کو بڑے شدّومد کے ساتھ اپنایا گیا لیکن چند سالوں کے بعد ہی جب اس دلفریب نظریے کے روح فرسا نتائج سرمایہ داری کی صورت میں سامنے آئے تو پوری انسانیت تڑپ اٹھی اور اس نے اس آزادی کو یکسر سلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

نظریات کی تیسری قسم — وہ نظریات جو بظاہر تو دلکش دکھائی نہیں دیتے مگر درحقیقت انسانی فوز و فلاح کے ضامن ہوتے ہیں سب سے زیادہ تر مذہبی دوائر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی نظریات چونکہ انسانی عقل کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ خالق کائنات کی طرف سے عطا کیے جاتے ہیں اس لیے انسان کی محدود عقل بسا اوقات ان کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتی۔ ٹھوس نتائج سامنے آنے ہی سے ان کی حقیقی افادیت کا راز کھلتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ اسلام کے عائلی قانون تعدد ازدواج کو ہی لیجیے۔ اس اصول کے ذکر ہی سے عقلیت پرستوں کی جبینیں شکن آلود ہو جاتی ہیں اور وہ اسے وحشیانہ طرز زندگی کی ایک بھیانک یادگار سمجھتے ہوئے اس پر طعنہ زنی شروع کر دیتے ہیں لیکن انسان کی معاشرتی زندگی کی پوری تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ آج تک جن انسانی معاشروں نے زنا، صحبت ہم جنس اور اسی طرح کے دوسرے معائب سے اپنے آپ کو پاک رکھا ہے یہی وہ معاشرے تھے جنہوں نے تعدد ازدواج کے اصول کو پوری خوشدلی کے ساتھ اپنایا۔ اس حقیقت کا اظہار کسی مسلمان مفکر یا مؤرخ نے نہیں کیا بلکہ ان اہل علم نے کیا ہے جو اس گروہ سے متعلق ہیں جن کے نزدیک عائلی زندگی میں تعدد ازواج سے زیادہ کسی دوسرے سنگین جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ کو اس کی تصدیق مطلوب ہو تو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اور ایتھکس کے اندر "شادی" کے ذیل میں اسے خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ یہ دائرۃ المعارف جن لوگوں کی زیر نگرانی تیار ہوا ہے، ان کی "اسلام دوستی" سے بھی پوری دنیا آگاہ ہے۔

یورپ میں گذشتہ چند سالوں سے صنعتی انارکی کا جو خوفناک طوفان اٹھا ہے اس کی تہ میں آزادی اور

حریت کے دلفریب نظریات ہی کام کر رہے ہیں ۔ اس طوفان کا آغاز بھی دیگر طوفانوں کی طرح باد صبح کے لطیف جھونکوں سے ہوا لیکن اس نے جلد ہی ایک نہایت وحشتناک صورت اختیار کر لی ۔ پہلے تو اس ناقابلِ تردید حقیقت کا پرچار شروع ہوا کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے ۔ پھر اس حق کی بنیاد پر آزادی نسواں کی تحریک شروع کی گئی اور اس طرح عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر خارجی زندگی کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش لا کر کھڑا کیا جانے لگا ۔

پھر آزادی کے مفہوم میں بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس انداز کی معنویت پیدا کی گئی جس سے عورت ایک کمانے والے کارکن کے علاوہ مرد کے ہاتھ میں ایک ایسا کھلونا بن کر رہ گئی جس کی تخلیق کا واحد مقصد مرد کے صنفی جذبات کی تسکین قرار پایا ۔ انسانیت کو اس غلط رُخ پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے آزادی کی آڑ میں نہایت گمراہ کن فلسفے گھڑے گئے ۔ فرائڈ نے ایک خاص حد تک صحیح اور معقول بات سے غلط نتائج اخذ کر کے آزاد شہوت رانی کے لیے فضا ہموار کی ۔ انسان کے اندر جنسی خواہش کا وجود ایک مسلم حقیقت ہے ، پھر یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح اور درست ہے کہ اگر اس خواہش کی تسکین کا خاطر خواہ انتظام نہ کیا جائے تو اس سے انسان کے قوٰی کافی حد تک متاثر ہوتے ہیں ۔ خصوصاً ذہنی خلفشار کی وجہ سے انسانی صلاحیتیں نکھرنے نہیں پاتیں اور وہ مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں ۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں اور کوئی معقول انسان ان کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ اگر فرائڈ بھی اس انداز سے سوچتا اور غور کرتا اور انسان کی صنفی جبلت کو اس کے فطری حدود میں رکھنے کے لیے کوئی صحت مندانہ تجاویز پیش کرتا تو یہ نوع بشری پر اس کا بہت بڑا احسان ہوتا لیکن بدقسمتی سے اس نے آزادی کے صحیح مضمرات کو سمجھے بغیر یہ رائے قائم کر لی کہ انسانی عمل کا سب سے طاقتور محرک صنفی میلان ہی ہے اور اگر اس بپھری ہوئی داخلی قوت کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی جائے یا اسے بعض ضابطوں کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے تو انسان کی شخصیت تباہ ہو جاتی ہے ۔ اس لیے انسان کے صحیح نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی جبلت کو اپنی تسکین کے لیے کھلے مواقع فراہم کیے جائیں اور اس راہ میں وہ جو قدم بھی اُٹھائے اس پر نیک و بد یا محمود و مذموم کا کوئی حکم لگا کر یا جنت کی بشارتوں اور دوزخ کی صعوبتوں سے مرعوب اور خوفزدہ

کرکے اس کے ذہن کو اس بارے میں قطعاً متاثر نہ کیا جائے کیونکہ اگر وہ اس نوعیت کے "غلط اثرات" کے تحت اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرے گا تو وہ متعدد ذہنی عوارض کا شکار ہو جائے گا۔

صنفی جبلت جب ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوگئی تو سیلاب کی طرح اس کی یلغار کا بھی کوئی متعین راستہ موجود نہ رہا۔ اس نے جس طرف چاہا بلا روک ٹوک آگے بڑھ کر مذہب و اخلاق کی لہلہاتی کھیتیوں کو برباد کرنا شروع کر دیا اور اب حال یہ ہوگیا کہ وہ لوگ جو آزاد شہوت رانی کے فلسفے کے پرچارک تھے وہ بھی اس اندوہناک صورت حال پر سخت مضطرب نظر آتے ہیں اور اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ آزادی کا یہ فلسفہ کس نوعیت کے تباہ کن نتائج پیدا کرے گا۔ امریکہ کے معروف ماہنامے میں "امریکہ میں طلاق" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے ان لوگوں کی ذہنی پریشانیوں کا کسی حد تک مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

برٹرنڈ رسل اور سگمنڈ فرائڈ دونوں کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ صنفی جبلت پر ناروا پابندیوں جو زیادہ تر کم علمی اور رسم و رواج کی پیداوار ہیں، نے عائلی زندگی میں دکھ بھر دیے ہیں۔ اس لیے دونوں اس بات کے آرزومند تھے کہ زندگی کے اس دائرے میں ردعمل پیدا ہو۔ چنانچہ یہ ردعمل فی الحقیقت ظاہر ہوا لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ گھڑی کے رقاص کی طرح اس شدت کے ساتھ مخالف سمت کی طرف بڑھے گا کہ اس سے معاشرے کا پورا ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ ان مفکرین نے تو اجتماعی مسائل کے بارے میں جہالت اور صنفی جذبات پر ظالمانہ پابندیوں اور عائلی زندگی میں منافقانہ روش کے خلاف جدوجہد شروع کی تھی ــــ اور اس میں انہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے لیکن افسوس اُن کی اس کامیابی نے آزادی کی صورت اختیار کرنے کے بجائے اباحت مطلقہ کی بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔

فاضل مضمون نگار بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ انسانی محاسن مثلاً شرافت، پاکدامنی، شرم و حیا سب بڑی تیزی کے ساتھ مغربی معاشرے سے حرف غلط کی طرح مٹائے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ فسق و فجور کا تسلط قائم ہو رہا ہے۔ صنفی جبلت نے محرک کی صورت چھوڑ کر جنون کی کیفیت اختیار کر لی ہے اور انسان نے اس جنون کے زیر اثر رشتۂ مناکحت توڑ کر اور اس کے تقدس کو پامال کرکے آزاد شہوت رانی کو اپنا

دلپسند مشغلہ بنا لیا ہے۔

جب کوئی قوت حدود و قیود کی پابند نہ رہے اور جذبۂ جنون کی صورت اختیار کر کے ہو، بیٹیوں کی قبائے عفت تار تار کرنا شروع کر دے تو اس دیوانگی میں عالم میں انسانوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ ایک خاص حد پر آکر خود بخود رک جائیں گے، انتہائی نادانی ہے۔ ایک فرد جس طرح جنونی کیفیت کے تحت آپے سے باہر ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح معاشرہ بھی جنون کے زیر اثر شائستگی کی ساری حدود پھلانگ جاتا ہے بلکہ اپنی اس ذلیل حرکت کو ہی وہ بڑی کامیابی خیال کرتا ہے۔ یہی حال مغربی معاشرے کا بھی ہوا ہے۔ جس وقت آزاد شہوت رانی کا طوفان اُٹھا تو معاملہ مرد و زن کے باہمی تعلقات کے بگاڑ تک محدود نہ رہا بلکہ صحبت ہم جنس نے ایک انتہائی خوفناک وبا کی صورت اختیار کر لی اس سے انسانی صحت، اخلاق اور عائلی زندگی کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مرض دنیا کے مہذب ممالک میں کس قدر سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اس کا ایک جائزہ حال ہی میں امریکہ کے مشہور ہفت روزہ ٹائم میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار کے تجزیہ کے مطابق یہ وبا برق رفتاری کے ساتھ امریکی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ آج سے پچیس برس پیشتر جب کینزے نے امریکہ کی اخلاقی حالت کا جائزہ پیش کیا تو اس کے مطابق اس وقت عورتوں میں صرف ایک سے دو فیصد خواتین اس مہلک مرض کا شکار تھیں اور مردوں میں ۱۳ فیصد افراد اس فساد میں گرفتار تھے۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ امریکہ کے دو کروڑ باشندے فخر و مباہات کے انداز میں اپنے اس "کارنامے" کا کھلے بندوں تذکرہ کرتے ہیں اور اس میدان میں ان کے حوصلے اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے سیاسی جماعتوں کی طرح اپنے آپ کو مختلف تنظیموں کے تحت منظم کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ تنظیمیں روز بروز قوت حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں اور ان کی وجہ سے امریکہ کے اندر فشاری گروہ معرضِ وجود میں آ رہے ہیں جن کے دباؤ میں آکر امریکہ کی کئی ایک ریاستیں اس گھناؤنے جرم کے لیے قانونی جواز فراہم کرنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔

معاملہ صرف قانونی جواز تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس انسانیت سوز جرم کے بارے میں اہل علم کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں بھی بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ مغرب کے ملحد اگرچہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس جرم کو پہلے بھی کوئی زیادہ معیوب نہ سمجھتے تھے مگر وہ اس بات کے ضرور قائل تھے کہ جو لوگ بھی اس جرم کا ارتکاب

کرتے ہیں وہ نفسیاتی مریض ضرور ہیں اور اگر اُن کے اس مرض کا مداوا کر دیا جائے تو وہ صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ با الفاظ دیگر لفظوں میں ماہرین نفسیات اس جرم کو ایک نفسیاتی عارضہ بہر طور تسلیم کرتے تھے لیکن یہ ان رنگین اور آوارہ مزاج نوجوانوں جنہیں امریکہ میں اب " GAYS " کے لفظ سے پکارا جاتا ہے، کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ذہنی عوارض کے اطباء نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ گھناؤنا جرم کسی ذہنی عارضہ کی غمازی نہیں کرتا بلکہ ایک صحت مند شخص بھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کے ایک خاص جریدے میں جس کا نام "کالج انگلش" ہے مدیر کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اساتذہ کو اپنے تعلیمی فرائض کا احساس کرتے ہوئے ان سارے تجربات کو اپنے طلبا کے سامنے لانا چاہیے جو اُنہیں اس فعل کے سلسلے میں حاصل ہوتے ہیں تاکہ جو نوجوان اس مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں ان کے دل سے احساس گناہ مٹ جائے اور ان کے اندر ضمیر کی کوئی خلش باقی نہ رہے۔

جو فعل صدیوں سے اپنے ساتھ گناہ کا ایک خوفناک اور بھیانک تصور لیے آ رہا ہے اس فعل کے بارے میں لوگوں کے اندر یہ تاثر قائم کرنا کہ یہ ایک معصوم سی "تفریح" ہے، کوئی آسان کام نہیں۔ امریکی والدین نوجوانوں کی اس روش سے سخت نالاں ہیں۔ انہیں اس امر کا پوری طرح احساس ہے کہ اگر معاشرے میں یہ فعل ایک جرم کی حیثیت سے موجود رہے تو اس کے مٹانے کی تدابیر ہو سکتی ہیں اور لوگوں کے اندر اس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات بیدار کر کے اس کی کسی حد تک روک تھام ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ بُرائی، بُرائی نہ رہے بلکہ عوام کے نزدیک یہ ایک جائز فعل قرار پا جائے تو پھر اس کے اثرات کو زائل کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ کوئی ریاست یا معاشرہ یا انسانوں کا اجتماعی ضمیر بُرائی کا تدارک تو کر سکتا ہے لیکن اگر اس بُرائی کو بُرائی ہی نہ سمجھا جائے تو پھر اس کے خلاف جد و جہد کی کوئی مؤثر صورت باقی نہیں رہتی۔

اس گھناؤنے فعل کے مرتکبین کو مندرجہ بالا حقیقت کا پوری طرح احساس ہے چنانچہ ان کی ساری جد و جہد آجکل صرف اس نقطہ پر مرکوز ہے کہ اس جُرم کو کسی طرح جُرم کے زمرے سے نکال کر " تفریح " یا " دل لگی " کے زمرے میں شامل کر دیا جائے اور عوام کے ذہنوں میں اس کے خلاف نفرت کے جو جذبات موجود ہیں وہ ختم کیے جائیں۔ اس مذموم مقصد کے حصول کے لیے وہ سارے حربے اختیار کیے جا رہے ہیں جو عام طور پر بدکردار لوگ

اپنے جرم کی خفت مٹانے کے لیے کرتے ہیں۔ آپ روزمرہ زندگی میں کسی شرابی یا مرتشی کے طرزِ عمل کا جائزہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی مجرم ضمیر جب پہلی بار کسی اخلاقی حد کو توڑتا ہے تو اس کے اندر احساس ندامت پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے جرم کو عوام سے چھپانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لیکن جرم کے مسلسل ارتکاب سے ایک طرف تو اس کا ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے دوسرے اُسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اب لوگوں کو میری بداعمالیوں کا علم تو ہو گیا ہے اس لیے انہیں چھپانا بیکار ہے۔ چنانچہ جرم کے ارتکاب کے معاملہ میں زیادہ جری اور احساسات کے معاملے میں حیا سے عاری ہو جاتا ہے اور پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ جذبۂ تفاخر کے ساتھ اپنے اِن جرائم کا اس انداز سے اظہار کرتا ہے گویا کہ اس نے کوئی بہت بڑی فتح حاصل کی ہے۔ یہی حال یورپ کے ان نوجوان مجرموں کا ہے وہ جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں تو مبارک اور سلامت کے پیغامات کے ساتھ اپنے ان گھناؤنے افعال کا ذکر کرتے ہیں اور جو لوگ اس عادت بد کا شکار ہیں انہیں قوت کے زور سے اس بات کے لیے مجبور کرتے ہیں کہ وہ کھل کر سامنے آئیں اور فخر سے سر اُونچا کر کے ببانگ دہل لوگوں کو اپنے ان "کمالات" سے آگاہ کریں۔ جو حضرات علم النفس سے تھوڑی سی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اپنی بُرائی کی تشہیر کا یہ انداز کسی گہرے اضطراب کا پتہ دیتا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایک شخص خواہ وہ الفاظ کی صورت میں کچھ ہی کہے مگر زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنی نظر میں، خاندان اور برادری کی نظر میں، معاشرے کی نظر میں بلکہ پوری انسانیت کی نظر میں ایک ایسی پست سطح پر اُتر چکا ہوں جس سے نیچے کسی دوسری سطح کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے خود بھی اور اہل دنیا نے بھی میری ذات کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ جس بیباکی کو یہ لوگ اپنی انا کی ظفرمندی خیال کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنی اخلاقی موت کا اعتراف ہوتا ہے اور اپنی جس بُرائی کو وہ بظاہر خوشی اور مسرت کے اُبلتے ہوئے جذبات کے ساتھ بیان کرتے ہیں اُن کے سوتے یاس و قنوطیت سے پھوٹتے ہیں۔ مجلسی تبسم ضروری نہیں کہ ہر حال میں شادمانی کا نتیجہ ہو۔ بسا اوقات چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ اپنے اندر گہرے درد کو بھی سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ چونکہ امریکہ کے بعض بدکردار افراد اپنی بدکرداری کو فخریہ انداز میں بیان کرنے لگے ہیں اس لیے اس بدکرداری نے نیکی کا روپ دھار لیا ہے، بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ اہل یورپ اخلاقی اعتبار سے پستی کے اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں انسانی ضمیر مُردہ ہو جاتے ہیں اور افراد مایوسی کی تصویر بن کر اچھائی اور بُرائی کا امتیاز کھو دیتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے آوارہ مزاج نوجوان وہاں کے بوڑھوں کو ترغیب و ترہیب کے ذریعے اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ (باقی بر صفحہ ۴۸)

فصل ششم

عالمگیر اُمّتِ مُسلمہ کی تاسیس

(۳)

اہل ایمان سے کفار کے تعلق کی نوعیت | ایک طرف اُمّتِ مسلمہ کے اندر اُس کے افراد کا باہمی تعلق اور اپنے دین و ایمان سے اُن کی وابستگی کو صاف صاف بیان کیا گیا۔ اور دوسری طرف یہ بھی بتا دیا گیا کہ کفار سے مسلمانوں کا تعلق کس طرح کا ہونا چاہیے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران - ۲۸)

مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء - ۱۴۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (التوبہ - ۱۶)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جانفشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا۔

سورۂ توبہ کی اس آیت میں خطاب مدینے کے اُن لوگوں سے کیا گیا ہے جو نئے نئے اسلام لائے تھے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ جب تک تم اس آزمائش سے گزر کر یہ ثابت نہ کرو گے کہ واقعی تم خدا اور اس کے دین کو اپنی جان، مال

اور اپنے بھائی بندوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہو، تم سچے مومن قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اب تک تو ظاہر کے لحاظ سے تمہاری حیثیت یہ ہے کہ اسلام چونکہ مومنینِ صادقین اور سابقینِ اوّلین کی جانفشانیوں سے غالب آگیا اور ملک پر چھا گیا اس لیے تم مسلمان ہو گئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

(التوبہ ۲۳-۲۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو اُن کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى

تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے اُن معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت

تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ
(الممتحنہ - ۴)

ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ
(الممتحنہ - ۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم اُن کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔ وہ رسول کو اور تم کو اس بنا پر نکال باہر کرتے ہیں کہ تم اللہ اپنے رب پر ایمان لائے ہو۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ
(المجادلہ - ۲۲)

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے اُن کو قوت بخشی ہے۔

سورۂ مجادلہ کی اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک بات اصولی ہے، اور دوسری امر واقعی کا بیان۔ اصولی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دینِ حق پر ایمان اور اعدائے دین کی محبت، دو بالکل متضاد چیزیں ہیں جن کا ایک جگہ اجتماع کسی طرح قابلِ تصور نہیں ہے۔ یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ ایمان اور دشمنانِ خدا و رسول کی محبت ایک دل میں جمع ہو جائیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک آدمی کے دل میں اپنی ذات کی محبت اور اپنے دشمن کی محبت دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ ایمان کا دعویٰ بھی

کرتا ہے اور ساتھ اُس نے ایسے لوگوں سے محبت کا رشتہ بھی جوڑ رکھا ہے جو اسلام کے مخالف ہیں تو یہ غلط فہمی تمہیں ہرگز لاحق نہ ہونی چاہیے کہ شاید وہ اپنی اِس روش کے باوجود ایمان کے دعوے میں سچا ہو۔ اِسی طرح جن لوگوں نے اسلام اور مخالفینِ اسلام سے بیک وقت رشتہ جوڑ رکھا ہے وہ خود بھی اپنی پوزیشن پر اچھی طرح غور کر لیں کہ وہ فی الواقع کیا ہیں، مومن ہیں یا منافق ؟ اور فی الواقع کیا ہونا چاہتے ہیں، مومن بن کر رہنا چاہتے ہیں یا منافق ؟ اگر ان کے اندر کچھ بھی راستبازی موجود ہے اور وہ کچھ بھی یہ احساس اپنے اندر رکھتے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے منافقت انسان کے لیے ذلیل ترین رویّہ ہے، تو انہیں بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش چھوڑ دینی چاہیے۔ ایمان تو اُن سے دو ٹوک فیصلہ چاہتا ہے۔ مومن رہنا چاہتے ہیں تو ہر اُس رشتے اور تعلق کو قربان کر دیں جو اسلام کے ساتھ اُن کے تعلق سے متصادم ہوتا ہے۔ اسلام کے رشتے سے کسی اور رشتے کو عزیز رکھتے ہیں تو بہتر ہے کہ ایمان کا جھوٹا دعویٰ چھوڑ دیں۔

یہ تو ہے اصولی بات۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف اصولی بیان پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ اِس امرِ واقعی کو بھی مدّعیانِ ایمان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش فرمادیا کہ جو لوگ سچے مومن تھے انہوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے تمام اُن رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ اُن کے تعلق میں حائل ہوتے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو بدر و اُحد کے معرکوں میں سارے عرب نے دیکھ لیا۔ مکّہ سے جو صحابۂ کرام ہجرت کر کے مدینے آئے تھے وہ صرف خدا اور اس کے دین کی خاطر خود اپنے قبیلے اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے لڑ گئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے باپ عبداللہ بن جرّاح کو قتل کیا۔ حضرت مُصعَبؓ بن عُمیر نے اپنے بھائی عُبَید بن عُمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مُغیرہ کو قتل کیا۔ حضرت ابو بکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عُبَیدہؓ بن الحارث نے عُتبہ، شَیبہ اور ولید بن عُتبہ کو قتل کیا جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ حضرت عمرؓ نے اسیرانِ جنگ بدر کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔ اِسی جنگِ بدر میں حضرت مُصعَبؓ بن عُمیر کے سگے بھائی ابو عزیز بن عُمیر کو ایک انصاری پکڑ کر باندھ رہا تھا۔ حضرت مُصعَب نے دیکھا تو پکار کر کہا" ذرا مضبوط باندھنا، اِس کی ماں بڑی مالدار ہے، اِس کی رہائی کے لیے وہ تمہیں بہت سا فدیہ دے گی"۔ ابو عزیز نے کہا" تم بھائی ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو"۔ حضرت مُصعبؓ نے جواب دیا" اِس وقت تم میرے بھائی نہیں ہو بلکہ یہ انصاری میرا بھائی ہے جو تمہیں گرفتار کر رہا ہے"۔ اِسی جنگِ بدر میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا

عباس اور داماد ابو العاص (حضرت زینبؓ بنت رسول اللہؐ کے شوہر) گرفتار ہو کر آئے، مگر ان کے ساتھ رسولؐ کی رشتہ داری کی بنا پر قطعاً کوئی امتیازی سلوک نہ کیا گیا جو دوسرے قیدیوں سے کچھ بھی مختلف ہوتا۔ اس طرح عالمِ واقعہ میں دنیا کو یہ دکھا دیا گیا کہ مُخلص مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ اُن کا تعلق کیسا ہوا کرتا ہے۔

دیلمی نے حضرت مُعاذ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا نقل کی ہے کہ اَللّٰھُمَّ لَا تَجعل لِفاجِرٍ (و فی روایۃ لِفاسِقٍ) عَلَیَّ یداً ولا نعمۃ فیودہ قلبی فانی وجدت فیما اوحیتَ اِلَیَّ لَا تَجِدُ قَوماً یُّؤمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالیَومِ الاٰخِرِ یُوَآدُّونَ مَن حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ "خدایا، کسی فاجر (اور ایک روایت میں ہے فاسق) کا میرے اُوپر کوئی احسان نہ ہونے دے کہ میرے دل میں اُس کے لیے کوئی محبت پیدا ہو۔ کیونکہ تیری نازل کردہ وحی میں یہ بات میں نے پائی ہے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھنے والوں کو تم اللہ اور رسول کے مخالفوں سے محبت کرتے نہ پاؤ گے"۔

کسی کی خاطر ایمان نہیں چھوڑا جاسکتا

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ ۚ حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ وَّفِصٰلُہٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ۔ وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْھُمَا وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ز (لقمان ۱۴-۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضُعف پر ضُعف اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دُودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اُس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو (میرا شریک) نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان، البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاھَدٰکَ لِتُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا ؕ (العنکبوت ۸)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھیرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو اُن کی اطاعت نہ کر۔

سورۂ عنکبوت کی اِس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اُن کی ماں حمنہ بنت سفیان بن اُمیّہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اُس نے کہا کہ "جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی، نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی ہو گی"۔ حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اِس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوتے ہوں جو مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان کی اُس آیت میں بھی پورے زور کے ساتھ دوہرایا گیا جسے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے اگر کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبور کریں تو اُن کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ وَاِنْ جَاهَدَاكَ - "اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اولیٰ رد کر دینے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد اُن کی خدمت کرے، اُن کا ادب و احترام کرے، اُن کی جائز باتوں میں اُن کی اطاعت بھی کرے۔ لیکن یہ حق اُن کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف اُن کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اِس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اُس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اسے اُس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اُس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اُس پر کھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم

اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ	ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم
وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ	اپنے اُوپر لے لیں گے۔حالانکہ اُن کی خطاؤں میں سے
مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَ	کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں، وہ قطعاً
لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ	جھوٹ کہتے ہیں۔ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اُٹھائیں گے
اَثْقَالِهِمْ ز وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی
عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۔	اور قیامت کے روز یقیناً اُن سے اِن افترا پردازیوں کی
(العنکبوت۔ ۱۲-۱۳)	باز پرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں۔

کفار کے اِس قول کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور حساب وجزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں۔لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی باز پرس بھی ہونی ہے، تو ہم ذمّہ لیتے ہیں کہ خدا کے سامنے سارا عذاب ثواب ہم اپنی گردن پر لے لیں گے۔تم ہمارے کہنے سے اِس نئے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دینِ آبائی کی طرف واپس آجاؤ۔روایات میں متعدد سردارانِ قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان سے مل کر یہ لوگ اِسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابو سفیان اور حرب بن اُمیّہ بن خلف نے ان سے مل کر یہی کہا تھا۔

اِس پر فرمایا گیا کہ اوّل تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے، کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا آپ ذمہ دار ہے۔لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو جس وقت کفر و شرک کا انجام ایک دہکتی ہوئی جہنم کی صورت میں سامنے آئے گا اس وقت کس کی یہ ہمت ہوگی کہ دنیا میں جو وعدہ اس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنت میں بھیج دیں، اور میں جہنم میں اپنے کفر کے ساتھ اُس کے کفر کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں؟

کفار کے لیے استغفار ممنوع ہے

مَا كَانَ	نبی اور ایمان لانے والوں کا یہ کام نہیں
لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ	ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی
يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ	دُعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار

كَانُوْٓا اُولِىْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔

ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ اُن پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔

(التوبہ - ۱۱۳)

کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اوّل تو ہم اُس کے ساتھ ہمدردی و محبّت رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زُمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو۔ لیکن جو شخص کھُلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جُرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اُصولاً غلط ہے بلکہ اِس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اِس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے، یہ چاہیں کہ اُسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مُقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اُسی لاگ کو قبول کرلے اور ہمارے رشتہ داروں کو تو ضرور بخش دے خواہ اُسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اُس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اُس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اُس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مشرکوں کے لیے مغفرت کی دُعا نہ کرو" بلکہ یوں فرمایا ہے کہ "تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے، تمہارا یہ کام نہیں ہے، کہ تم اُن کے لیے مغفرت کی دعا کرو"۔ یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو یہ کچھ بات نہ ہوئی۔ تم میں تو وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اُس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اُس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا تم کو خود اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دُنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مُواسات، اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دُنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے، مصیبت زدہ انسان کی بہر حال مدد کی جائے گی، حاجت مند آدمی کو بہر صورت

سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پہ یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

شادی بیاہ اور وراثت کا تعلق بھی اُن سے جائز نہیں

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنہ-۱۰)
نہ مسلمان عورتیں کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ۔ (الممتحنہ-۱۰)
اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔

البتہ اس حکم میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کرسکتے ہیں جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے۔ رہیں مسلمان عورتیں تو وہ مسلمان کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (البقرہ- ۲۲۱)

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔

حضرت اُسامہ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ
مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے۔

(بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

کافروں کی دو قسمیں اور ان کے ساتھ برتاؤ میں فرق

اِس طرح اُمتِ مسلمہ کو کفار سے پوری طرح الگ کر دینے کے بعد صرف ایک اعتبار سے دو قسم کے کافروں کے درمیان مسلمانوں کے برتاؤ میں فرق کیا گیا، اور وہ یہ ہے:

"اللہ تمہیں اِس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اِخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہ ظالم ہیں" (الممتحنہ۔ آیات ۸-۹)۔

بالفاظ دیگر مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ انہیں دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے اور اُن کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی اُن کے ساتھ کوئی بُرائی نہ کی ہو۔ اِس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اَسماءؓ بنت ابی بکر اور ان کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی کافرہ تھیں اور مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اَسماءؓ اُنہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حُدیبیہ کے بعد جب مکہ اور مدینہ کے درمیان آمد ورفت شروع ہوئی تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفے تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کا اپنا بیان ہے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر پوچھا "اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں اُن سے صلہ رحمی بھی کرسکتی ہوں؟" حضورؐ نے فرمایا "ملو بھی اور صلہ رحمی بھی کرو" (مُسند احمد، بخاری، مسلم)۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں باپ، بھائی بہن اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے اگر وہ دشمنِ اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذمّی مساکین پر صدقات بھی صرف کیے جاسکتے ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص۔ روح المعانی) (باقی)

امام بخاریؒ

ملک غلام علی صاحب

پوری اُمتِ مسلمہ بجا طور پر امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ کو "امام المحدثین" اور "امیر المومنین فی الحدیث" کے لقب سے ملقب کر کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتی چلی آرہی ہے اور اہل سنت کے ہر مکتبِ فکر کے علماء و فضلاء میں انہیں یکساں طور پر شہرتِ عام اور قبولِ دوام حاصل ہے - انہوں نے اپنی بیش بہا تصانیف بالخصوص "الجامع الصحیح" کے ذریعے سے سننِ نبویہ اور احادیثِ رسول کا جو مستند ترین ذخیرہ مرتب فرما کر ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ قرآن مجید کے بعد دوسرا روشنی کا مینار ہے اور ہر مسلمان خواہ وہ کسی مسلکِ فقہی سے وابستہ و منتسب ہو یا نہ ہو، صحیح البخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (اللہ کی کتاب کے بعد دوسری کتابوں میں صحیح ترین کتاب) تسلیم کرتا ہے - حافظ ابن حجرؒ شافعی فرماتے ہیں کہ "امام بخاری کے ہم عصروں کو چھوڑ کر فقط ان سے بعد میں آنے والے ائمہ نے جو تعریف و توصیف امام بخاری کی بیان کی ہے اگر اسے نقل کرنا شروع کیا جائے تو عمریں صرف ہو جائیں اور کاغذ کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔" امام بخاریؒ کے متعلق یہ حقیقت معلوم و واضح ہے کہ انہیں مسلک حنفی سے بعض مسائل میں اختلاف تھا - اس کے باوجود امام بدر الدینؒ عینی حنفی نے جب صحیح بخاری کی شرح عمدۃ القاری لکھی تو اس کے آغاز میں امام بخاریؒ کو الحافظ، الحفیظ، الشہیر، الناقد، البصیر کے خطابات سے یاد کیا اور فرمایا کہ "تمام ثقہ علماء اُمت ان کے حفظِ حدیث کی شہادت دیتے ہیں، جملہ شیوخِ حدیث ان کی فضیلت کے معترف ہیں اور نقدِ حدیث میں ان کی صحت کے معاملے میں دو علماء کا بھی باہمی اختلاف نہیں ہے۔"

تحصیلِ علم کا ذوق و شوق

اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیئت کی یہ عجیب شان ہے کہ اس نے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی سنت اور اسوۂ حسنہ کی محافظت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو عجمی النسل تھا جس کے آباؤ اجداد آتش پرست تھے، بخارا (موجودہ ازبکستان) میں آباد تھے اور وہاں کے مسلمان گورنر کے ہاتھ پر اسلام لائے۔

امام بخاری شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے (اور آپ کی وفات رمضان ۲۵۶ھ میں ہوئی[1])۔ آپ چھوٹی عمر ہی میں یتیم ہو گئے مگر آپ کو علمِ دین کے حصول کی ایسی لگن تھی اور ذہانت و یادداشت کا ایسا خداداد ملکہ حاصل تھا کہ دس برس بلکہ اس سے بھی کم عمر میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا اور علمائے حدیث کے حلقہ ہائے درس میں باقاعدہ شمولیت شروع کر دی۔ سولہ برس کی عمر میں آپ نے اپنے دیار کے تمام علماء کا ذخیرۂ حدیث اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اسی سال اپنی والدہ ماجدہ اور بھائی کے ساتھ حج کا سفر اختیار کیا۔ حج کے بعد والدہ اور بھائی تو وطن واپس لوٹے لیکن آپ نے تنہا مکہ معظمہ میں ڈیرے ڈال دیے اور دو سال مکہ کے شیوخِ حدیث کی شاگردی میں بسر کیے۔ پھر آپ مدینہ منورہ پہنچے اور کم و بیش چھ سال وہاں کی درس گاہوں میں شریک رہے۔ پھر آپ نے بصرہ، کوفہ، بغداد، شام، مصر اور اپنے وطن خراسان کے بلاد سمرقند، تاشقند، مرو، بلخ، ہرات، نیشاپور وغیرہ کے پے در پے سفر کیے اور اس طرح پورے عالمِ اسلام کے قریب ایک ہزار سے زائد اساتذہ کے اندوختۂ علم اور سرمایۂ حدیث کو اپنے سینے اور سفینے میں سمیٹ لیا۔

صحیح البخاری کی تصنیف امام بخاری نے جس وقت اپنی شہرہ آفاق تصنیف صحیح البخاری کا آغاز کیا ہے اس وقت انہیں چھ لاکھ احادیث حفظ تھیں جن میں سے انہوں نے الجامع الصحیح کا انتخاب کیا۔ چھ لاکھ کی تعداد پر متعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حدیث کا شمار متن کے بجائے سند کے لحاظ سے ہوتا ہے اور ایک ہی متنِ حدیث اگر سو سندوں سے مروی ہو، تو یہ سو احادیث گنی جائیں گی۔ مزید برآں اس دور میں صحابۂ کرام کے اقوال و فتاویٰ پر بھی بالعموم حدیث کا اطلاق کر دیا جاتا تھا۔ بعض صحیح احادیث کو اختصار کے پیشِ نظر بھی امام بخاری نے اپنی کتاب میں درج نہیں کیا۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض نام نہاد "محققین" کی جہالت و جسارت کا یہ حال ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ احادیث کی اتنی بڑی تعداد میں سے صرف چند ہزار کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ باقی

---

[1] امام بخاری کی بارہ صد سالہ یادگار حال ہی میں دنیا بھر میں منائی گئی ہے۔ اگست ۱۹۷۴ء کے نصف آخر میں اس سلسلے کی ایک کانفرنس سمرقند میں بھی منعقد کی گئی جس کی روداد روسی سفارت خانے کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسالے "طلوع" کے شمارہ دسمبر ۱۹۷۴ء میں چھپی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ خرتنگ (نزد سمرقند) جہاں "حضرت اسماعیل بخاری ؒ" کا مقبرہ ہے، وہاں "ایک پرانی مسجد کو مکمل طور سے بحال کیا گیا"۔ واضح رہے کہ اس روداد میں ہر جگہ امام بخاری کا نام حضرت اسمٰعیل لکھا گیا ہے فافہم و تدبر۔ غ

سب احادیث امام بخاری کے نزدیک غلط اور موضوع تھیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، میں امام بخاری کے زیرعنوان یہودی گولڈ زیہر GOLDZIHER کے حوالے سے لکھا ہے:

HE BEGAN TO SIFT THE ENORMOUS MATERIAL AND ONLY A VERY SMALL PART OF IT HE DARED TO USE AS AUTHENTIC TEACHING OF THE PROPHET.

(امام بخاری نے حدیث کے بہت بڑے ذخیرے کی جانچ پڑتال شروع کی اور اس کے نہایت قلیل حصے کو وہ رسول کی مستند تعلیم قرار دینے کی ہمت کر سکے)۔ یہودی اور عیسائی مستشرقین ہمارے ذخیرۂ حدیث کی قدر و قیمت گھٹانے کی ناکام کوشش اس وجہ سے بھی کرتے ہیں کہ خود اُن کے اپنے ناقدین کے اعتراف کی رو سے ان کی تاریخی روایات، تلمود، حتیٰ کہ خود بائبل کے عہد قدیم و جدید دونوں حصوں کا حال یہ ہے کہ یہ انسانی تصانیف ہیں جن کے مصنفین کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا تو ایک طرف رہا، ان کے نام اور سوانح و کوائف بھی گمنامی کے گوشوں اور تاریکی کے غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، اصل نوشتوں کے بجائے ان کا صرف ترجمہ بلکہ ترجمہ در ترجمہ اس وقت موجود ہے اور مترجمین بھی مجہول الاسم والحال ہیں۔ اس کے برعکس بحمد اللہ قرآن و حدیث کے قراء، حفاظ اور کاتبین عہد نبوی و عہد صحابہ سے لے کر اب تک، کسی انقطاع کے بغیر تسلسل و تواتر کے ساتھ انہیں ایک طبقے اور ایک نسل سے دوسری تک منتقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ روئے زمین کی کوئی دوسری قوم اپنے دینی ورثے کو اس یقین و اعتماد اور ایسے قوی ترین اسناد کے ساتھ پیش نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنانِ اسلام چاند پر خاک ڈالنے کی حماقت کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ چاند پر خاک ڈالو تو اپنے منہ پر پڑتی ہے۔

صحیح البخاری کی ترتیب و تدوین اور نظر ثانی پر امام صاحب کے پورے سولہ برس صرف ہوئے ہیں اور اس کا اکثر و بیشتر حصہ آپ نے بیت اللہ یا مسجد نبوی کے محراب و منبر کے مابین بیٹھ کر تحریر کیا ہے۔ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے تھے اور دو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔ حرمین شریفین کے متبرک و مقدس ماحول میں جو کتاب اس طہارت و تقویٰ اور خشوع و خضوع کے ساتھ سپرد قلم ہوئی ہو، اسے جس نے لکھا ہو گا، جو اسے پڑھے گا اور جو اس پر عمل کرے گا اس کی دنیا و آخرت سنور جانے اور مستحق اجر ہونے میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے؟

اس کتاب کے امتیازی اوصاف امام بخاری کی یہ کتاب اپنی بعض دوسری صفات و خصوصیات میں بھی بالکل منفرد ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب کے جن راویوں پر جرح کی گئی ہے یا جن کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے میں اختلاف ہے

ان کی تعداد قلیل اور دوسری کتابوں کے مجروح راویوں سے مقابلۃً بہت کم ہے۔ پھر امام صاحب کے ایسے راوی زیادہ تر وہ ہیں جو ان کے شیخ اور ہم عصر ہیں اور ان کی روایات بھی ایسی ہیں جنہیں امام صاحب نے ہر طرح سے خوب چھان پھٹک کر نقد و جرح کے بعد لیا ہے۔ اسی لیے امام بخاری کے متعلق محدثین کا عام مقولہ ہے کہ جس راوی کی جو حدیث امام بخاری نے اپنی الجامع الصحیح میں لے لی وہ راوی اس حدیث کے ساتھ پل پار کر گیا (جاز القنطرہ)۔

احادیثِ مُعنعَنہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں نمایاں طور پر جس دوسری شرط کو ملحوظ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ایک راوی جب دوسرے راوی سے فقط عَنْ FROM کے صیغے سے روایت کرتا ہے تو دونوں میں اتصالِ روایت کو تسلیم کرنے کے لیے امام بخاری نے دونوں راویوں کی محض معاصرت کو کافی نہیں سمجھا بلکہ دونوں کی ملاقات کے ذکر و ثبوت کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ یہ ایک ایسی کڑی شرط ہے جس کی امام صاحب نے نہایت شدت سے پابندی کی ہے حالانکہ دوسرے محدثین حتیٰ کہ امام مسلم نے بھی اسے ضروری نہیں قرار دیا ہے اور اس بات کو کافی سمجھا ہے کہ جب دونوں راوی عادل اور ثقہ ہیں اور ایک ہی زمانے میں حدیث کو اخذ و روایت کر رہے ہیں تو ایک نے دوسرے سے براہِ راست سماع کے بغیر حدیث کو بیان نہیں کیا ہوگا۔ بہر حال اس ایک ہی شرط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام بخاری کے ہاں صحتِ حدیث کا معیار کتنا سخت اور بلند و بالا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

سکّہ کر در یثرب و بطحا زدند نوبتِ آخر بخارا زدند

(جو سکّہ ابتدا میں مدینہ و بطحاء کی ٹکسال میں ڈھالا گیا تھا۔ آخرِ کار وہی سکّہ بخارا میں جا کر تیار ہوا)

بخاری کے تراجم ابواب امام بخاری نے اپنی الجامع الصحیح میں ایک عمدہ التزام یہ بھی کیا ہے کہ بالعموم ہر چند احادیث کو ایک باب کے تحت یکجا کر کے ان پر جو عنوان (ترجمۃ الباب) مقرر کیا ہے اس میں ان فقہی احکام کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اس باب کی احادیث سے مستنبط کیے جا سکتے ہیں۔ ان عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام بخاری ایک جلیل القدر محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبہ فقیہہ بھی تھے۔ ان کے فقہی استدلال سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر ان کے تفقہ فی الدین سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے محدثین کے ہاں یہ مثل بھی مشہور ہے کہ فقہ البخاری فی تراجم ابوابہ (بخاری کی فقہ ان کے عنواناتِ ابواب میں موجود ہے)۔ پھر یہ عنوانات محض مصنّف کی فقہی آرا پر مشتمل نہیں بلکہ ان میں جا بجا وہ قرآنی آیات بھی درج ہیں جن کا اس موضوع یا مسئلے سے ربط و تعلق

ہے جو احادیثِ باب میں مذکور ہے۔ قرآن مجید کی آیات کو اس طرح کتبِ حدیث کے آغازِ ابواب میں لانے کا اسلوب بالعموم محدثین نے اختیار نہیں کیا۔ البتہ امام محی الدین نووی نے اپنے انتخاب ریاض الصالحین میں اس سے ملتا جلتا انداز اپنایا ہے اور ابواب کے عنوانات کے تحت حدیث لانے سے پہلے آیات قرآنی درج کی ہیں۔

معلّقات و فتاویٰ امام بخاری نے اپنے تراجم (عنوانات) میں مزید یہ خصوصیت بھی پیدا کی ہے کہ ان کے اندر سند کو حذف یا مختصر کر کے بعض ایسی احادیث یا ان کے ٹکڑوں کو درج کر دیا ہے جو دوسرے جامعینِ حدیث کے ہاں پوری سند اور تخریج کے ساتھ موجود ہیں مگر امام بخاری کی اعلیٰ شرائط کے مطابق ان کے نزدیک وہ اصطلاحاً "صحیح" کی تعریف سے خارج ہیں۔ سند اور مکمل متن کے بغیر اس طرح کی روایات کو "تعلیقات" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بخاری کے تراجمِ ابواب میں بعض صحابۂ کرام اور تابعین کے فتاویٰ بھی منقول ہیں۔ اس لحاظ سے یہ عنوانات اپنی جگہ پر بڑی جامعیت و افادیت کے حامل ہو گئے ہیں اور ان میں قرآن، حدیث، آثارِ صحابہ اور اجتہاداتِ فقہاء کے باہمی علاقہ و ارتباط کا ایک خوبصورت اور دلآویز عکس پایا جاتا ہے۔

تقطیع و تفصیل صحیح بخاری میں احادیث کی تکرار و تقطیع اور اختصار و تفصیل کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ایک مضمون کی احادیث کا مختلف ابواب میں اعادہ کیا گیا ہے، لیکن کہیں ایک ٹکڑا ہے، کہیں دوسرا ٹکڑا ہے۔ ایک جگہ الفاظ مختصر ہیں، دوسری جگہ اس سے مختلف یا مفصل ہیں۔ یہ انداز عام قارئین کے لیے کچھ اشکال و اعتراض کا موجب بن جاتا ہے لیکن امام صاحب نے اسے بلاوجہ یا غیر ضروری طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اس میں ان کے پیشِ نظر متعدد مقاصد و مصالح ہیں۔ مثلاً کہیں وہ سند میں صحابی یا دوسرے راوی کو بدل کر لاتے ہیں اگرچہ متن یکساں ہوتا ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حدیث "غریب"[1] نہیں بلکہ "متواتر" یا "مشہور و مستفیض" ہے کبھی ایک ہی حدیث سے مختلف احکام و مسائل مستنبط ہوتے ہیں، اس لیے اس کا جو حصہ جس مسئلے سے متعلق ہوتا ہے اتنے حصے کو متعلقہ باب میں لاتے ہیں، اور دوسرا حصہ دوسری موزوں جگہ درج کرتے ہیں۔ کبھی روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے الفاظ مختلف ہو جاتے ہیں جو مختلف سندوں سے مروی ہوتے ہیں اس لیے امام بخاریؒ ہر سند کے الفاظ الگ الگ یا مختلف مقامات پر بیان کر دیتے ہیں تاکہ جن معانی پر ارشادِ نبوی مشتمل ہے اس کا کوئی گوشہ قلب و نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

---

[1] غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے کسی ایک مرحلے پر سند کا انحصار ایک راوی پر ہو گو وہ ثقہ ہو۔ یہ غرابت صحتِ حدیث کے منافی نہیں۔

بعض روایات ایسی ہوتی ہیں جو سند کے اعتبار سے بیک وقت متصل، مُرسَل اور موقوف ہوتی ہیں، یعنی ایک سند میں تو روایت کی کڑیاں بالکل مکمل ہوتی ہیں مگر دوسری میں صحابی یا تابعی کا نام کسی وجہ سے حذف ہوتا ہے مگر راوی تمام ثقہ ہوتے ہیں۔ ایسی تمام صورتوں میں امام بخاریؒ متصل اور غیر متصل اسناد کی سب صورتیں بیان کرکے اس حقیقت کا تصوّر دلاتے ہیں کہ سند کی بعض صورتوں کا عدمِ اتصال حدیث کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوسکتا بلکہ متصل سند کی موجودگی میں غیر متصل سند حدیث کی صحت و تقویت میں اضافے ہی کا موجب ہوگی۔ اسی طرح جو روایات عَنْ کے الفاظ سے آئی ہیں اگرچہ ان میں راویوں کی ملاقات امام صاحب کے نزدیک شرط لازم ہے (جیسا کہ پہلے بیان ہوا) اس کے باوجود وہ ایسی مُعَنْعَنْ روایات کو مختلف سند یا متن سے دوبارہ لاتے ہیں تاکہ صحت میں کوئی ادنیٰ شائبہ باقی نہ رہے۔

مسلکِ اہل سنّت اس حقیقت کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے ذریعے سے بیک وقت حدیث و فقہ کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے اور ابواب کے عنوانات کی ترتیب میں اپنے مسلک فقہی کو سمو دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں یہ بھی واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اپنے تراجم ابواب تجویز کرتے وقت اسلامی علم کلام اور فلسفہ تشریع کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ اسلامی علم کلام اپنے صحیح معنوں میں اُن دلائل نقل و عقل پر مشتمل ہوتا ہے جن کی بنیاد کتاب و سنت یا اقوالِ صحابہ پر قائم اور استوار کی گئی ہو اور جن میں اسلام کے احکام و عقائد، ان کے اسرار و رموز اور مصالح و فوائد عام فہم اور دل نشین انداز میں پیش کیے گئے ہوں۔ ضمناً اس میں یہ چیز بھی شامل سمجھی گئی کہ یونانیوں، مجوسیوں، یہود و نصاریٰ اور دوسرے غیر مسلموں کے نظریات و فلسفہ جات، اور خود مسلمانوں کے باہمی سیاسی و اعتقادی اختلافات جس طرح مسلمانوں کی فکری اور تمدنی وحدت کو متاثر کر رہے تھے، اس کا سدِّباب کیا جائے اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم یعنی اہل سنت کا مسلک اُجاگر کیا جائے۔ امام بخاریؒ کے عہد میں بلکہ اس سے ماقبل بھی خوارج، معتزلہ، جبریہ، قدریہ، مُرجئہ وغیرہ کے فرقے وجود میں آچکے تھے جو عقیدہ و عمل کے معاملے میں کتاب و سنت کے مسلکِ اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط میں مبتلا ہوگئے تھے۔ خوارج خود خاطی انسان ہونے کے باوجود بزعم خویش دوسروں کی بہت سی خطاؤں کو گناہ کبیرہ قرار دے کر ان کے مرتکبین کو کافر اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ معتزلہ اپنے عقلی تَفَلْسُف اور ریشنلزم کے بل پر کتاب و سنت کے متعدد نُصوص کی ناقابلِ جواز تاویل کرتے تھے جو تحریف کے ہم معنی تھی اور وہ بھی مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں تو کفر و اسلام کے مابین معلّق سمجھتے تھے۔ مرجئہ کہتے تھے

کہ ایمان کے محض زبانی اقرار کے بعد کسی نیک عمل کی سرے سے حاجت ہی نہیں اور کوئی بڑی سے بڑی بدعملی حتیٰ کہ شرک و بت پرستی بھی سرے سے موجبِ مواخذہ ہی نہیں۔ ایک طرف وہ نام نہاد قلبی معرفت کو لسانی اقرار کے بغیر ایمان کے مترادف کہتے تھے، دوسری طرف قلبی تصدیق کے بغیر محض زبانی دعوائے ایمان کو بھی معتبر قرار دیتے تھے۔ قدریہ انسان کو اپنے اعمال کا خالق و مختارِ مطلق سمجھتے تھے اور جبریہ اس کے برعکس انسان کو مجبورِ محض اور مشیتِ الٰہی کا آلۂ بے جان قرار دیتے تھے۔ ان گمراہانہ اور انتہا پسندانہ افکار و مواقف نے مسلم معاشرے میں سخت خلفشار اور تفرقہ برپا کر رکھا تھا۔ امام بخاری نے ان تمام نزاعات و اختلافات میں توسط کی راہ متعین کرنے اور اصحاب سلف اور اہلِ سنت کا موقف ممیز کرنے کے لیے اپنی صحیح میں متعدد ابواب قائم کیے اور ان کی مناسبت سے صحیح احادیث کو ان کے تحت درج کیا۔ صحیح بخاری کے متعدد ابواب (مثلاً کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الاعتصام بالسنۃ، کتاب التوحید وغیرہ) کو بغور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مقصود اہلِ سنت کے مسلک کا اثبات اور اہلِ بدعت کے نظریات کا ابطال ہے۔ اس سے پہلے امام ابوحنیفہؒ نے اسی مقصد کے لیے اپنا کتابچہ الفقہ الاکبر مرتب کیا تھا جس کے نام ہی سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانے میں اصولِ دین اور عقائد و کلام کے مباحث بھی فقہ کا ایک جز شمار ہوتے تھے۔ امام بخاریؒ نے ان گمراہ فرقوں کے رد میں مزید کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں کتاب الرد علی المعطلۃ، کتاب خلقِ افعالِ العباد زیادہ مشہور ہیں۔

مسئلۂ خلقِ قرآن اس زمانے کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ خلقِ قرآن بھی تھا جو معتزلہ کا پیدا کردہ تھا جس کی بنا پر امام احمد بن حنبل کو ناقابلِ بیان تعذیب کا نشانہ بنایا گیا اور صدہا دوسرے علماء و محدثین کو مصائب و شدائد کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ فتنہ ۲۱۸ھ سے ۲۲۸ھ تک عباسی خلیفہ مامون اور معتصم کی سرپرستی میں عروج پر رہا اور جو شخص قرآن مجید کو مخلوق نہیں کہتا تھا اس کی جان سلامت نہ تھی۔ امام بخاری کے زمانے تک اس کے آثار باقی تھے۔ اس لیے آپ کو بھی ناگزیر طور پر اس کی زد میں آنا پڑا۔ جب آپ نیشاپور میں مقیم اور وہاں کے مشہور محدث محمد بن یحییٰ ذہلی کے شریک مجلس تھے تو امام بخاریؒ سے پوچھا گیا کہ خلقِ قرآن کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

> "قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے لیکن جو قرآنی الفاظ میری یا دوسروں کی زبان سے نکلتے ہیں وہ مخلوق ہیں کیونکہ یہ تکلم ہمارا فعل ہے اور ہمارے سب افعال مخلوق ہیں۔"

درحقیقت یہ ایک محتاط اور مبنی برحق جواب تھا مگر یہ جواب امام ذہلی تک کو پسند نہ آیا اور پورا شہر امام بخاریؒ کا مخالف ہوگیا۔ صرف امام مسلم نے آپ کا ساتھ دیا اور تائید کی حالانکہ وہ خود امام ذہلی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے امام ذہلی سے جس ذخیرۂ حدیث کی سماعت وکتابت کی تھی اُسے اُونٹوں پر لاد کر امام ذہلی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

آخری ابتلاء اسی طرح کی ایک آزمائش کا سامنا آپ کو اپنے وطن بخارا میں کرنا پڑا جو آخرکار آپ کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ خالد ذہلی حاکم بخارا نے آپ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ اس کے لڑکوں کو گھر جاکر پڑھائیں یا کم از کم اپنے ہاں انہیں الگ وقت دیں۔ امام صاحب نے یہ مطالبہ منظور نہ کیا اور فرمایا کہ وہ دوسرے شاگردوں کی صف میں آکر بیٹھیں اور تحصیلِ علم کریں۔ چنانچہ آپ کے خلاف الزام عائد کیا گیا کہ آپ قرآن کو مخلوق کہتے ہیں اور آپ کو بخارا چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔ بخارا سے آپ بیکند پہنچے مگر وہاں بھی قرار نہ مل سکا۔ عجیب بات ہے کہ اس دارِ فنا میں جن لوگوں کو چند روزہ اقتدار نصیب ہوجاتا ہے وہ انا ولاغیری کا ڈنکہ بجاتے اور خدا کے نیک بندوں کو ناحق ستاتے ہیں۔ آخرت میں تو جو ہوگا سو ہوگا لیکن آج دنیا میں بھی اہلِ دنیا دیکھ لیں اور عبرت حاصل کریں کہ امام بخاری کا نام تو چاردانگ عالم میں زبان زدِ خلائق ہے لیکن اُس عاملِ بخارا کو کوئی جانتا تک نہیں اور جن شائقینِ علم کو امام بخاریؒ کی ذات اور حالات سے دلچسپی ہے صرف وہی اس حاکم کا ذکر کرتے اور اس پر نفرین بھیجتے ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار۔ آخرکار آپ ایک قریبی بستی خرتنگ کے لیے روانہ ہوئے جو سمرقند کے قریب تھی اور جہاں آپ کے ایک رشتہ دار رہتے تھے۔ وہاں آپ نے رات تہجد کی نماز پڑھی اور دُعا مانگی:

"اے میرے اللہ، تیری زمین اپنی فراخی کے باوجود میرے لیے تنگ ہوگئی ہے تو مجھے اپنے ہاں کشادگی عطا فرما۔"

یہ دُعا قبول ہوئی اور ۲۵۶ھ میں رمضان کے روزے پورے ہونے پر عیدالفطر کی رات باسٹھ[62] برس کی گردشِ لیل ونہار کے بعد آسمانِ علم کا یہ آفتاب اہلِ دنیا کی نگاہوں سے غروب ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں ایک عالم عبدالواحد بن آدم کا واقعہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صحابہ کرام کے ساتھ کسی کا انتظار فرما رہے ہیں۔ انہوں نے سلام کیا اور عرض کیا: جناب کس کے منتظر ہیں؟ تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے محمد بن اسماعیل البخاریؒ

کا انتظار ہے" چند روز کے بعد امام بخاری کی وفات کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ امام صاحب کے انتقال اور اس خواب کا وقت اور تاریخ بالکل ایک ہی تھی۔

اللہ سے ہماری دعا ہے کہ وہ اس سرچشمۂ علومِ سنّت سے ہماری دنیا و عقبیٰ کو بھی سیراب فرمائے جسے امام بخاریؒ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں اور اس امام عالی مقام کی طرح ہمیں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے اور جنت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب و اتباع کی معیت نصیب فرمائے۔ آمین و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

صہیونی اسرائیلیوں کی مُسلم آزاری

(یروشلم کے مقاماتِ مقدسہ کی تخریب و توہین)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

(۲)

خود اسرائیلی اربابِ اختیار میں بھی اختلاف تھا۔ تاہم ۱۲ جنوری میں کونسل کے ایک ممبر نے بلند و تد کہا کہ ۱۹۶۷ء کے بعد سے میونسپلٹی کو مکانوں کی تیز رفتار تعمیر پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وزراء کا کہنا ہے کہ ان کے سامنے اہم سیاسی مقاصد ہیں [۱]

نیوز ویک مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۱ء میں اسرائیلیوں کے تعمیری منصوبوں کا یہ مقصد سامنے آیا کہ عربی خطہ یروشلم چاروں طرف سے وسیع یہودی تعمیری پراجیکٹوں کے گھیرے میں لے لیا جائے۔ ایک مدعا یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ یروشلم میں یہودی ووٹوں کی مستقل اکثریت رہے۔ مشرقی حصے میں یہودیوں کی اتنی تعداد ہونی چاہیے کہ یروشلم کے عربی علاقوں کو واپس اردن کے حوالے کرنے کی کسی بھی تجویز کا توڑ کیا جا سکے۔[۲]

ڈیلی سٹار مورخہ ۴ فروری (بحوالہ AL-DIFFA) نے اطلاع شائع کی کہ اسرائیلی پارلیمنٹ ایک نیا قانون پاس کر رہی ہے جس کے مطابق وہ یروشلم کے مسلم مقاماتِ مقدسہ کو قبضے میں لے کر ہیکل سلیمانی کی تلاش کے لیے ان کی کھدائی کرنا چاہتی ہے۔[۳]

۱۷ فروری کے نیشنل ہیرلڈ ٹریبیون کے بیان کے مطابق ہاؤسنگ منسٹری کے ۵ ایسے نوجوانوں کو برطرف کر دیا گیا جو متذکرہ "تعمیراتی" منصوبے پر تنقید کرتے تھے۔[۴]

۱۸ فروری ۱۹۷۱ء کو امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان مسٹر رابرٹ میکسکلوسکی (RABERT MECLOSKY) نے مقبوضہ علاقہ یروشلم میں ۱۲۲۰۰۰ یہودی افراد کے لیے ۳۵ ہزار اقامت گاہوں

۱، ۲، ۳، ۴ THE RAPE OF OLD CITY - P: 2, COL: 2.

کی تعمیر کے منصوبے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا...... مسٹر رابرٹ کا مزید کہنا یہ تھا کہ یہ کارروائی یروشلم کی مسلمہ حیثیت کے لیے ضرر رساں ہے۔ مگر اسرائیلی وزیر تعمیرات (M ZOV SHAREF) نے منصوبے کے حق میں جواباً یہ کہا کہ اس کا مقصد شہر کے یہودی کیریکٹر کو مضبوط کرنا اور اسے بین الاقوامی رنگ اختیار کرنے سے بچانا ہے۔[1]

ڈیلی اسٹار پورے سال (۱۹۷۱ء) میں مسلسل بیرونی حکومتوں کی ایک بڑی تعداد کی طرف سے یروشلم میں یہودی طرز عمل کے خلاف احتجاج پیش کرتا رہا۔ احتجاج کنندگان میں بلجیم، رومانیہ، سوئٹزرلینڈ، دی ورلڈ مسلم کانگریس، دی انٹرنیشنل اسلامک آرگنائزیشن آف انڈونیشیا، دی سپریم کونسل آف اسلامک افیئرز مصر، جنرل اسلامک کونسل آف یروشلم، مسلم ورلڈ لیگ (رابطہ عالم اسلامی مکہ) گنی، یو۔ ایس۔ اے اور کینیڈا کے پیروانِ یسوع، ہسپانیہ، یو کے اور ویٹیکن شامل ہیں۔[2]

یہودی جریدے (LE MONDE) کی ۲۲ فروری کی اشاعت میں اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری مسٹر اوتھانٹ کا یہ بیان مذکور ہے کہ ان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ جنگ بندی کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ کے قائم کردہ دفتر کے آس پاس یروشلم کے عربی علاقے میں یہودی تعمیرات کے منصوبے کو معلوم کر سکیں۔ نیز یہ کہ پریس رپورٹروں کی رُو سے اقوامِ متحدہ کے قائم کردہ مراکز کے حقِ استحفاظ کی خلاف ورزیوں کا (اسرائیلیوں کی طرف سے) اندیشہ ہے۔[3]

گارجین ۲۲ فروری کے بقول بین الاقوامی تشویش اور اضطراب کا اثر اُلٹا ہوا۔ اسرائیلی ضم کردہ شرقی یروشلم میں فلیٹوں کے بلاک تعمیر کرنے کے منصوبوں پر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ یروشلم کے میئر مسٹر کالیک (KOLLEK) نے کہا کہ میں غیر ملکی مداخلت کے اس لمحے میں اس امر کے لیے واقف ہوں کہ یروشلم کے تمام موزوں عمارتی رقبوں میں یکدم تعمیرات کر ڈالی جائیں۔ یہ تمام پراجیکٹ عربوں سے ضبط کردہ اراضی سے متعلق تھے۔[4]

بحوالہ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹرابیون مورخہ ۲۴ فروری اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے جلسے میں مصری اور اردنی وفود کی طرف سے سیکرٹری جنرل کو اس صورتِ واقعہ پر احتجاجی نوٹ دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۶۷ء میں جنرل اسمبلی کی پاس کردہ دو، اور سلامتی کونسل کی تین قرار دادیں اسرائیل کو اقوام متحدہ سے بے نیازی کی روش سے باز نہیں

---

۱ THE RAPE OF OLD CITY P:2 COL:2 P:3 :COL: 1

۲، ۳، ۴ THE RAPE OF OLD SITY , P: 3, COL: 1

رکھ سکیں۔ اُلٹا اپنے کیے کرائے پر باضابطہ مہر توثیق ثبت کرنے کے لیے یروشلم کی میونسپل کونسل نے اپنے ایک ریزولیوشن میں کہا کہ یروشلم کو ایک کرنے کی کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور یہ کہ آئندہ یروشلم کو ہمیشہ کے لیے اسرائیل کا دارالحکومت قرار پانا ہے۔[۱]

۲۵ ستمبر ۱۹۷۱ء کو سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر ۲۹۸ پاس کر کے اسرائیل کو یروشلم کی حیثیت تبدیل کرنے سے باز رہنے کا مطالبہ کیا۔ نیز سابق قراردادوں پر عمل نہ کرنے پر اظہار افسوس کیا۔[۲]

۲۷ ستمبر کے گارجین نے لکھا کہ اسرائیل نے متذکرہ ریزولیوشن کو مسترد کر دیا ہے اور اس کی بنیاد پر کسی گفت و شنید میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔[۳]

۳ اکتوبر کے آبزرور کا بیان ہے کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے یروشلم کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن بھیجنے کے لیے اسرائیل سے درخواست کی مگر اس کا کوئی رسمی جواب نہیں دیا گیا۔[۴]

نیو اسٹیٹسمین ۶ اجولائی نے اڈیٹوریل میں اسرائیلیوں کی ناجائز تعمیراتی کارروائیوں کی تیز رفتاری کے حق میں اُن کا یہ نقطۂ نظر بیان کیا کہ قبل اس کے کہ گفت و شنید کی میز پر دلیل بازی کا وقت آئے، ایک صورتِ واقعہ کو موجود ہونا چاہیے۔[۵]

۱۱ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیلی فوج کی کاریں کھڑی کرنے کی جگہ بنانے کی خاطر ۱۳۵ کمروں اور ۲ مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا۔ اس تبدیلی کا نقشہ رپورٹ میں شامل ہے۔[۶]

۱۴ اپریل ۱۹۶۸ء کو عربی املاک کے ۲۰٪ حصے کو اسرائیل کے انخلائی افسروں نے ضبط کر لیا۔ اس ضبطی کی زد میں ۵۹۵ عمارتیں آئیں۔ ان میں ۱۰۴۸ رہائشی کمرے، ۴۳۷ دکانیں، ۴ مدرسے اور ۵ مسجدیں شامل ہیں۔ اس تبدیلی کا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔[۷]

۱۴ جون ۱۹۶۹ء کو اسرائیلی فوج نے ۱۴ عمارتوں پر قبضہ کر لیا جن میں ایک مسجد بھی شامل ہے۔ ان سب پر

---

۱ THE RAPE OF THE OLD CITY P: 3. COL: 1, 2

۲، ۳، ۴، ۵ IBID P: 3, COL: 2

۶ IBID P: 7.

۷ IBID P. 10.

بل ڈوزر چلا کر ان کا صفایا کر دیا گیا - نیز ۲۰ جون ۱۹۶۹ء کو ۱۷ عمارات قبضے میں لے لی گئیں جن میں ایک وقف شدہ مسلم مذہبی مدرسہ بھی شامل تھا - نقشہ دیا گیا ہے[1]

۱۹۷۰ء کے بعد سے اس وقت (رپورٹ کی ترتیب و اشاعت کے وقت) تک ۳۰ عمارات کی بنیادوں کے نیچے کھدائی کا سلسلہ جاری ہے جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے شہرہ رکھتی ہیں اور تاریخی پہلو سے افادیت کی حامل ہیں - ان کھدائیوں کی وجہ سے بعض کو غیر محفوظ قرار دے کر انہیں مسمار کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں[2]-

۳۰ اگست ۱۹۷۰ء کو اسرائیلی حکام کی طرف سے مسلمانوں کے قبرستانوں اور حرم شریف کے اِردگرد کی وقف جائیداد کو ضبط کرنے کا حکم صادر کیا گیا[3]-

شکیل ضیا نے اپنی کتاب کے آخر میں کچھ تصاویر دی ہیں، ان میں دکھایا گیا ہے کہ یہودی مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ میں شراب نوشی اور رقص جیسی حرکات کر رہے ہیں - ناگفتنی یہ کہ ایک جوڑے کو حیوانی جذبات کی تسکین کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے -

معابد کسی بھی قوم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، کسی خدا پرست پیرو انبیاء اور با اخلاق گروہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ محض انتقامی جذبات کے تحت ایسے مقامات میں سفلگی کا مظاہرہ کرے گا - ایسی ذلیل حرکات کی توقع ایک مغضوب قوم ہی سے کی جا سکتی ہے[4]-

الخلیل میں صہیونی جبر و وحشت کا رقص یہاں میں ضروری معلومات حسان کلیمی کے مضمون سے لے رہا ہوں کیونکہ حسان کلیمی ایسی پوزیشن میں ہیں کہ وہ بیرونی احوال کی تازہ ترین تفاصیل سے آگاہ ہونے کے ذرائع رکھتے ہیں -

بیت المقدس سے ۲۰ میل جنوب میں "الخلیل" (جسے یہودی جبرون کہتے ہیں) فلسطین کا دوسرا مقدس شہر ہے یہاں مسجد ابراہیم چودہ سو سال سے عظمتِ اسلام کے پھریرے اڑا رہی ہے مسلمانانِ عالم کے نزدیک یہ مسجد حرم کعبہ مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ کے بعد سب سے زیادہ متبرک اور مقدس عمارت ہے - اس کے فرش کے نیچے "مُکْفِلہ" (MACHPELA) کے مشہور غار میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت اسحاقؑ کے مزار ہیں جن کے

---

[1] THE RAPE OF THE OLD CITY P: 12

[2], [3] IBID P: 14

[4] SHAKIL ZIA HISTORY OF JEWISH CRIMES (KARACHI)

تعویذ مسجد کے بالائی فرش پر بنے ہوئے ہیں۔

۵ رجون ۱۹۶۷ء تک الخلیل اُردن کا ایک پُر امن اور خوشحال شہر تھا جہاں دنیا بھر سے ہر سال لاکھوں زائر پہنچتے تھے۔ لیکن عرب اسرائیل جنگ (۱۹۶۷ء) کے بعد صیہونیوں کے تسلط کی وجہ سے صورتِ حالات پوری طرح بدل گئی۔

اوّلین اقدام صیہونیوں کا یہ تھا کہ انہوں نے باہر سے آنے والے یہودیوں کو اس شہر میں بسانا شروع کیا۔ اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا کہ یہ شہر اسرائیلی ریاست کی تشکیل کے وقت (۱۹۴۸ء میں) خالص مسلم آبادی پر مشتمل تھا اور اب تک وہ اسی طرح ہے۔ اس کی یہی حیثیت اُردنی حکومت کے تحت بھی برقرار رہی۔ لیکن اسرائیلی فوج اور صیہونیت زدہ مذہبی جنونیوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ یہودیوں نے الخلیل کے اردگرد مسلمانوں کے گاؤں تباہ کیے الخلیل کے تاریخی اور مقدس شہر کی قدیم عمارات کو ڈھایا اور یہاں نوآمدہ یہودیوں کو بسانا شروع کیا۔ بیت اِلّا کا پورے کا پورا مسلمانوں کا گاؤں ڈائنا مائیٹ سے اُڑا دیا گیا۔ اسی طرح کی مذموم ظالمانہ کارروائیوں سے یہودیوں کے لیے جگہیں بنائیں۔

اب اگلا قدم یہ تھا کہ یہودی نوآبادکاروں نے اسرائیلی حکام اور مذہبی جنونیوں کی جماعتوں کی پشت پناہی سے مکفلہ کے غار اور حرم کے ایک چھوٹے سے حصے میں اپنی عبادت شروع کر دی۔ اس پر پھر احتجاج ہوا مگر بے سود۔ بالآخر مسلمانوں نے اشتعال کی حالت میں یہودیوں پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسرائیلی فوج مسلمانوں پر پل پڑی اور بے حد جانی و مالی نقصان ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۸ء میں الخلیل کے مسلمان اکابر اور مذہبی رہنماؤں نے یہودی حکام سے شکایت کی کہ یہودی حرم مقدس میں داخل ہو کر اس کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں اسرائیل کے فوجی گورنر نے مسلمان زعماء کو دھمکی دی کہ یہودیوں کو حرمِ ابراہیمی میں داخل ہو کر عبادت کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، اور اگر ضرورت ہوئی تو اسرائیل اس معاملے میں طاقت استعمال کرے گا۔ موشے دایان نے اعلان کیا کہ یہودی مسلمانوں کے احتجاج کے علی الرغم مسجد میں داخل ہو کر عبادت کریں گے۔ مسلمانوں نے مسجد کے تحفظ کے لیے مزاحمت کی۔ اس پر اسرائیلیوں نے حرم ابراہیمی پر حملہ کر کے مسجد کے مشرقی دروازے اور زینے کو تباہ کر دیا۔ موشے دایان الخلیل کے مسلمان رئیسِ بلدیہ اور دوسرے مسلمان اکابر کو دھمکی دی کہ انہیں بزور جلاوطن کر کے دریائے اُردن کے اس پار دھکیل دیا جائے گا۔

بعد ازاں الخلیل کے نوآبادکار یہودیوں نے اعلان کیا کہ وہ حرمِ ابراہیمی میں اپنی عبادت کے لیے ایک مندر تعمیر

کریں گے۔ گذشتہ چند سال میں ایک تدریج کے ساتھ اس اعلان کو جامۂ عمل پہنایا گیا ہے۔

۱۹۶۸ء میں دایان نے یہودیوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ جمعہ کے علاوہ اور دنوں میں مسجد کے ایک مخصوص حصے میں عبادت کر سکتے ہیں۔ اس ابتدا کی اب انتہا یہ ہے کہ یہودی جمعہ کے دن بھی حرم میں آ گھستے ہیں اور اسرائیلی حکمران ان کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں یوم سبت سے قبل کی عبادت کرنا یہودیوں کے لیے ضروری ہے۔ اب یہ لوگ مسجد کے ایک گوشے تک محدود نہیں رہ سکتے، بلکہ مسجد کے بڑے حصے کو استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ عملاً اب وہ مزاروں والے دو بڑے ہال کمروں پر قابض ہیں اور یہ حصہ اس سے بڑا ہے جو مسلمانوں کے لیے چھوڑا گیا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء میں مسلمانوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودیوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ وہ حرم کے اندر اپنے علاقے کو توسیع دیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مزار (تعویذ) کے گرد مسجد کے فرش پر یہودی پہلے ہی قابض تھے۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ مزار یعقوبؑ کے گرد جو جگہ ہے اسے مزار ابراہیمؑ سے ملانے کے لیے وہ ایک نئی چھت بنا کر پھر چوطرفہ اپنا احاطہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حرم کے ایک قدیم کنویں کو تباہ کر دیا ہے مسجد کی ایک دیوار بھی توڑ دی ہے اور یہودی اپنے استعمال کے لیے الماریاں، رحل اور چٹائیاں لا کے ڈال چکے ہیں۔

اس وقت حال یہ ہے کہ یہودی مسجد ابراہیمی میں غل مچا کر تورات پڑھتے ہیں اور مسلمانوں کی نمازمیں خلل ڈالتے ہیں۔ اہانت اسلام کی ایک واضح مثال یہ بھی ہے کہ جنونی یہودی مسجد کے اندر مسلمانوں کی نماز جنازہ کی کھلم کھلا تضحیک اور بے حرمتی کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی بار جنازوں کو الٹ دیا ہے۔

حال ہی میں جنونی یہودیوں کی جماعت "یہودی ڈیفنس لیگ" کے سو سے زائد غنڈے الخلیل میں آئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ الخلیل کا مسئلہ کلی طور پر حل کرنے اور اسے یہودی شہر بنانے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے رئیس بلدیہ علی الجعبری سے مطالبہ کیا کہ وہ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۴۸ء کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے الخلیل کے دروازے یہودیوں کے لیے چوپٹ کھول دیں۔ مذکرہ سالوں میں مسلمانوں نے الخلیل کو مکمل طور پر مسلم شہر بنا رکھنے کی کوششیں کی تھیں۔ رئیس بلدیہ کو یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ دو ہفتے کے اندر ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

مسلمانوں کے خلاف یہودی ہتھکنڈوں کی ایک مثال حال ہی میں سامنے آئی۔ الخلیل کے مفسدین نے حرم ابراہیمی میں خود تورات کے اوراق پھاڑ کر منتشر کر دیے اور بعد میں واویلا مچا دیا کہ مسلمانوں نے مقدس صحیفہ کی توہین کی ہے۔

واضح رہے کہ یہ سب کچھ سلامتی کونسل کی پاس کردہ اس قرارداد کے علی الرغم ہو رہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

۱۔ حرمِ ابراہیمی چودہ سو سال سے مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔

۲۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مسلمانوں کی مسجد میں مندر یا کوئی دوسری عبادت گاہ تعمیر کرے۔

۳۔ مسجد ابراہیم نہ تو الخلیل کے باشندوں کی ملکیت ہے نہ اسلامی کونسل کی، بلکہ اس پر تمام مسلمانانِ عالم کا حق ہے۔

۴۔ مسجد کے کسی حصے پر یہودی قبضہ مسلمانانِ عالم کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔[۱]

مضمون کے خاتمے پر واقعۂ الخلیل کے متعلق ایک تازہ شہادت کا اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اُردن کے وزیر اوقاف ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط نے جو درد انگیز خط ان دنوں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں روانہ کیا ہے اس کا ضروری اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اسرائیل کے وزیر دفاع نے مسجدِ ابراہیمی کو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کر کے اس کے بڑے حصے کو یہودیوں کا معبد بنانے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ اسرائیل نے اس مقدس مقام پر قبضہ کرنے کے لیے سیکڑوں یہودیوں کو بھیج دیا ہے۔ انھوں نے یہاں جمع ہو کر نہ صرف ناقوس بجایا، شراب پی کر غل غپاڑہ کیا اور ختنے کی رسومات ادا کیں بلکہ مسلمان نمازیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے مسجد کے امام اور حامیوں اور محافظوں پر بھی ہلّہ بول دیا۔ پھر فساد کے انسداد کے بہانے اسرائیلی دستے بھیج دیے گئے جنھوں نے نمازیوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اب مسلمانوں کو صرف نماز کے مقررہ اوقات میں صرف ایک دروازے سے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔"[۲]

پس چہ باید کرد! | بیت المقدس اور الخلیل کے مذکرہ سانحات کا کیا اتنا ردِّ عمل کافی ہے کہ احتجاجی تقریریں ہو جائیں اور مذمت کی قراردادیں پاس ہو جائیں! کیا دنیائے اسلام کی دینی غیرت و حمیت کی آخری حد یہی ہے؟ کیا پہلے کسی احتجاج اور مذمت سے اسرائیلی صہیونیوں نے کوئی اثر لیا ہے؟ اور کیا دنیا بھر کی نمائندگی کرنے والی تنظیم اقوام متحدہ کی ایک ایک قرارداد کو اس نے اندازِ تمسخر سے پیروں تلے روند نہیں ڈالا ہے؟

---

[۱] مضمون مسجد ابراہیمی میں یہودی مندر کی تعمیر از حسان کلیمی۔ شائع کردہ: اخبار انتخاب کراچی، مورخہ ۱ جولائی ۱۹۷۵ء۔

[۲] سرورق ہفت روزہ ایشیا لاہور۔ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۷۵ء۔

اس سلسلے میں میرا یہ مقام نہیں کہ میں اکابرملین کو مشورے دوں اور نہ یہ توقع کرسکتا ہوں کہ میری تجاویز کسی کے لیے درخورِ اعتنا ہوں گی۔ لیکن شدید احساسِ کرب کے اظہار کا محض ایک راستہ یہ ہے کہ کوئی مؤثر لائحہ عمل سوچا جائے۔ مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی مجوزہ میٹنگ میں واضح خطوط کار متعین کیے جائیں۔ میری تجاویز یہ ہیں:-

۱۔ مصر و اسرائیل کی مفاہمت و مصالحت کا سلسلہ آناً فاناً اس شرط کے پورا ہونے تک ملتوی رکھنے کا اعلان کرا دیا جائے کہ یہودی مقاماتِ مقدسہ میں ہر قسم کی دخل اندازیوں سے باز آجائیں۔

۲۔ مسئلہ کے حل ہونے تک اسرائیل کے جہازوں کو نہ صرف نہر سویز سے گذرنے کی اجازت نہ دی جائے، بلکہ اسرائیل سے آنے یا جانے والے جہازوں کو دنیا کے کسی مسلم ملک کی بندرگاہ پر رکنے کا اذن نہ دیا جائے۔

۳۔ تمام مسلم ممالک طے کرلیں کہ وہ کسی ایسے وفد یا فنی ماہرین کی کسی ایسی جماعت کو اپنے ہاں آنے نہیں دیں گے جس میں کوئی یہودی رکن شامل ہو۔ اسی طرح مغربی ممالک کی کسی ایسی فرم کے ہاتھ نہ کوئی مال (مع تیل کے) بیچا جائے اور نہ اس سے خریدا جائے جس کے غالب حصہ دار یا سرمایہ کار یا ڈائرکٹر یہودی ہوں۔

۴۔ اقوامِ متحدہ میں اس بنیاد پر اسرائیلی ریاست کی رکنیت ختم کرنے کی قرارداد مسلم ممالک کی طرف سے متفقہ طور پر لائی جائے کہ یہودیوں نے اقوامِ متحدہ کی ان تمام قراردادوں کی جو اسرائیل کو کسی امر کا پابند بنانے یا کسی امر سے روکنے کے لیے پاس کی گئیں (خصوصاً یروشلم کے مقاماتِ مقدسہ اور عرب آبادی اور تاریخی عمارات اور یادگاروں کے متعلق)، بلا استثنٰی خلاف ورزی کی اور خلاف ورزیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

امریکہ اگر روٹھ کر الگ ہوتا ہے تو ہوجائے اور ادارۂ اقوامِ متحدہ اس کے چندے سے محروم ہوتا ہے تو ہوجائے۔ عربوں کو چاہیے کہ یو۔ این۔ او کے دفاتر کو اٹھا کر جدہ یا قاہرہ میں لے آئیں اور اپنے مالی ذرائع سے اسے زندہ و توانا بنائیں۔

۵۔ مستقبل کا ضروری اقدام جو سب مسلمانوں پر واجب آتا ہے یہ ہے کہ مسلم ممالک اتنی طاقت پیدا کریں کہ یروشلم اور الخلیل، اور پھر پورے فلسطین کو یہودیوں کے ظالمانہ تسلط سے نکالیں ـــــ قرآن و حدیث کے واضح کلمات کی رُو سے ایک دن ایسا ہو کر رہے گا۔ قدرت نے پہلی بار یہودیوں کو دنیا بھر سے سمیٹ کر ایک چھوٹے سے کھلیان میں اس لیے جمع کر دیا ہے کہ ایک ہی بار اِس فصلِ بد کی گہائی اور روندائی ہوجائے۔ والامر بید اللہ القدیر۔

رسائل و مسائل

دُرود میں "سیدنا و مولانا" کا استعمال اور بعض اہم اُصولی بحثیں

(۲)

اضافے کی نظیریں اس کے بعد اُن نظائر کی طرف آیئے جو تعبّدی اور توقیفی امور میں بیشی، اور اوراد و صلوٰۃ کے ماثور الفاظ پر اضافے کے بارے میں ہم کو احادیث میں ملتی ہیں۔

حکم آنے سے پہلے مدینے میں جمعہ کا قیام عبد بن حمید، ابن المنذر اور عبدالرزاق نے ابن سیرین سے جو روایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے، بلکہ جمعہ کی فرضیت کا حکم نازل ہونے سے بھی پہلے مدینۂ طیبہ میں انصار نے آپس میں مشورہ کیا کہ جس طرح یہود اور نصارٰی نے ہفتے میں ایک دن اجتماعی عبادت کے لیے مخصوص کر رکھا ہے، اسی طرح ہم بھی ایک دن اس کام کے لیے مختص کر لیں۔ پھر انہوں نے جمعہ کا دن اس کے لیے تجویز کیا اور اس کا قدیم نام یومِ عَرُوبہ چھوڑ کر نیا نام جمعہ رکھ دیا۔ اس تجویز کے مطابق پہلی نمازِ جمعہ حضرت اسعدؓ بن زرارہ نے پڑھائی۔ اس کی تائید ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، بیہقی اور دارقطنی کی اُس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے اُن کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے نقل کی ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جمعہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا جس میں چالیس آدمی شریک ہوئے تھے۔ دارقطنی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جمعہ کا حکم مکۂ معظمہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوا۔ اُس وقت مکے میں اقامتِ جمعہ ممکن نہ تھی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُصعبؓ بن عُمیر کو لکھا کہ تم مدینے میں جمعہ قائم کرو۔ طبرانی میں حضرت ابومسعود انصاری کی روایت ہے کہ اس حکم کے مطابق جو پہلی نماز جمعہ حضرت مُصعب نے پڑھائی۔

اُس میں بارہ آدمی شریک تھے[۵]۔ یہاں دیکھیے، صحابہ کی ایک جماعت باہمی مشورے سے بطور خود ایک نئی نماز کا اضافہ کرتی ہے، حضوؐر کی حیاتِ طیّبہ میں یہ واقعہ پیش آتا ہے، مگر اس پر حضوؐر کسی ناراضی کا اظہار نہیں فرماتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اُسی نماز کی فرضیت کا حکم نازل ہو جاتا ہے، اور وہی نماز جو حکم سے پہلے شروع کی گئی تھی، از روئے حکم قائم کی جانے لگتی ہے۔

حضوؐر کی موجودگی میں ماثور الفاظ پر اضافہ | بخاری، مسلم، ابوداؤد، مُسند احمد، نسائی اور طبرانی میں حضرت رفاعہؓ بن رافع کی روایت ہے کہ ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ رکوع سے سر اُٹھا کر جب حضوؐر نے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فرمایا تو پیچھے سے ایک شخص نے کہا رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ۔ نماز سے فارغ ہو کر حضوؐر نے پوچھا ابھی ابھی یہ بات کس نے کہی تھی؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ میں نے۔ حضوؐر نے فرمایا "میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اس کو لکھ لینے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ یہاں بھی آپ دیکھ لیں کہ اُس شخص نے حضوؐر کے سکھائے ہوئے الفاظ پر مزید چند الفاظ کا اضافہ خود کیا تھا۔ یہ زائد الفاظ حضوؐر کے بتائے ہوئے نہ تھے۔ اور اُس نے ماثور الفاظ پر یہ اضافہ حضوؐر کی موجودگی میں حضوؐر کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے کیا تھا۔ آپ کے نقطۂ نظر سے تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ حضوؐر اس پر سخت ناراضی کا اظہار فرماتے اور اُسے ڈانٹتے کہ ماثور الفاظ پر اپنی طرف سے چند الفاظ بڑھا کر تو نے خلافِ شرع حرکت کی ہے، تو میرے سامنے دین کے اندر ایک نیا طریقہ اختراع کرنے کی جسارت کر بیٹھا ہے، تیرے بڑھائے ہوئے الفاظ اگر شریعت میں مطلوب ہوتے تو میں اُن کی تعلیم دیتا، تو اُن کو اَورادِ نماز میں داخل کرنے والا کون ہوتا تھا۔ لیکن حضوؐر نے اُس کو پوری جماعت کے سامنے یہ بشارت دی کہ تیرے کلمات اتنے قابلِ قدر تھے کہ فرشتے اُن کو لکھنے کے لیے دوڑ پڑے، اور ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ ان الفاظ کو ثبت کرنے کی سعادت اُسے نصیب ہو جائے۔

---

[۵] سوال کیا جا سکتا ہے کہ حکم آنے سے پہلے انصار نے جو جمعہ بطور خود قائم کیا تھا اُس میں تو پہلے روز چالیس آدمی شریک ہوئے اور حکم آنے کے بعد جو جمعہ قائم کیا گیا اس میں صرف بارہ آدمی شریک ہوئے، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکم مکّے سے مدینے بھیجا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قاصد جمعہ ہی کے دن وہاں پہنچا ہو اور اس کا اعلانِ عام بروقت نہ کیا جا سکا ہو۔

تشہدؔ کے ماثور الفاظ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے داخل کردہ الفاظ کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ اس سے جان چھڑانے کے لیے جو تاویل آپ نے کی ہے وہ بالکل بے معنی ہے۔

ایک نئی اذان کا اضافہ مسند احمد اور نسائی کی روایت ہے کہ جمعہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر تشریف فرما ہو جاتے تھے تب بلالؓ اذان دیتے تھے، اور جب آپ منبر سے اُترتے تھے تو وہ تکبیرِ اقامت کہتے تھے۔ (یہ گویا دو اذانیں تھیں جو حضورؐ کے زمانے میں مقرر ہوئیں) - بخاری، نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت سائبؓ بن یزید کی روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں جمعے کی پہلی اذان اُس وقت دی جاتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا اور آبادی بڑھ گئی تو اُنہوں نے تیسری اذان (یعنی وہ اذان جو امام کے منبر پر آنے سے پہلے دی جاتی ہے) کا حکم دیا جو زَوراءؔ[1] کے مقام پر دی جاتی تھی۔ بخاری کی ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ جمعہ کے روز تیسری اذان کا اضافہ کرنے والے حضرت عثمانؓ تھے، جبکہ اہلِ مدینہ کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ طبَرانی کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ پہلی اذان اُس مکان پر دی جائے جس کا نام زوراء تھا۔ پھر جب وہ منبر پر بیٹھ جاتے تھے تو ان کا مؤذّن اذان دیتا تھا اور جب وہ منبر سے اُترتے تھے تو مؤذّن تکبیرِ اقامت کہتا تھا۔ یہ تعبّدی امور کے دائرے میں ماثور و مسنون عمل پر ایک صریح اضافہ تھا جو خلیفۂ برحق نے ایسے زمانے میں کیا تھا جبکہ صحابہ و تابعین سے دنیائے اسلام بھری پڑی تھی، مگر اس کی مخالفت تو کیا ہوتی، اسلامی دنیا کے بلاد و امصار میں وہ مقبول ہو گئی۔ صرف ایک ابن عمرؓ رضی اللہ عنہ ہیں جن کے متعلق ابن ابی شَیبہؔ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اسے بدعت کہا تھا۔ مگر حافظ ابن حجرؔ کہتے ہیں کہ "اُن کے اِس قول میں یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے اُسے مُنکر سمجھتے ہوئے بدعت کہا ہو، اور یہ احتمال بھی کہ انہوں نے اسے صرف اس بنا پر بدعت قرار دیا ہو کہ یہ طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج نہ تھا، اور ہر وہ کام جو آپ کے زمانے میں نہ ہوا ہو بدعت کہلاتا ہے۔ لیکن ایسے کاموں میں بعض اچھے ہوتے ہیں اور بعض اُس کے خلاف۔" حافظ کے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خود حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اس سے پہلے ایک "اچھی بدعت" کا ارتکاب کر چکے تھے۔ مزید برآں ایک اور فعل کو بھی اُنہوں نے بدعت قرار دینے کے بعد اس کی تحسین فرمائی تھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

[1] یہ مدینے کے بازار میں ایک اُونچا گھر تھا جس کی چھت پر مؤذّن اذان دیتا تھا تاکہ دور دور تک آواز پہنچ جائے۔

ابنِ عمرؓ کا چاشت کی نماز کو "اچھی بدعت" کہنا صلوٰۃِ ضحیٰ (چاشت کی نماز) کا پڑھنا بجائے خود تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، اس لیے اس کے سنت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اس کا التزام، یا مسجدوں میں اس کا پڑھا جانا حضورؐ کے عہد مبارک میں رائج نہ تھا، بعد کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے اس کے بارے میں دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا "بدعت ہے اور اچھی بدعت" (ابن ابی شیبہ)۔ ایک اور روایت میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "یہ نیا نکالا ہوا طریقہ ہے اور ان اچھے طریقوں میں سے ہے جو لوگوں نے نکال لیے ہیں" (سعید بن منصور)۔ اور ایک تیسری روایت میں ان کا ارشاد ہے "لوگوں نے کوئی نئی چیز ایسی نہیں نکالی ہے جو مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہو" (عبدالرزاق)۔ یہ تینوں روایتیں بالکل صحیح سندوں سے منقول ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہو فتح الباری، بابُ صلوٰۃِ الضحیٰ۔

حضرت عمرؓ کا تراویح کو "اچھی بدعت" کہنا نماز تراویح بھی حضورؐ کے عمل سے ثابت ہے، اس لیے اس کے سنت ہونے میں اختلاف نہیں ہے۔ مگر مسجد میں اس کا ایک ہی امام کے پیچھے پڑھا جانا، اور اسے باجماعت ادا کرنے کا عام رواج ایک نیا طریقہ تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں جاری کیا اور اس کے بارے میں فرمایا نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ (یہ ایک اچھی بدعت ہے)۔ یہ بھی تعبدی امور کے بارے میں شارع کے طریقے پر ایک اضافہ ہی تھا، لیکن حضرت عمرؓ جیسے سخت متبعِ سنت صحابی و خلیفہ نے اسے نیا طریقہ جانتے ہوئے اچھا طریقہ سمجھ کر جاری کیا اور صحابہ و تابعین، ائمہ مجتہدین، فقہاء و محدثین، سب نے بلا تامل اس کی پیروی کی۔

درود میں سیدنا و مولانا کے الفاظ کا استعمال اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعبدی اعمال میں رد و بدل اور کمی و بیشی کا قطعاً ممنوع ہونا، اور اس قاعدۂ کلیہ میں کسی استثناء کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہ ہونا ایک ایسا تشدد ہے جس کی تائید احادیثِ صحیحہ سے نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ درود میں ماثور الفاظ پر "سیدنا و مولانا" کا اضافہ کیا واقعی ناجائز اور ممنوع ہے؟ لیکن میں اس بحث کے آغاز ہی میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں درود میں صرف وہ الفاظ پڑھنا جائز سمجھتا ہوں جو بجائے خود حضورؐ کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے مشروع ہوں، خواہ درود کے ماثور الفاظ میں وہ شامل نہ ہوں۔

درود کے ماثور الفاظ پر ابن مسعودؓ کا اضافہ آپ کی یہ بات صحیح ہے کہ احادیث سے جتنے درود (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ درود) ثابت ہیں، ان میں سیدنا کا لفظ شامل نہیں ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اگرچہ وہ حافظ ابن حجر ہی نے کیا ہو، کہ کسی صحابی سے ایسا کوئی درود ثابت نہیں ہے۔ ابن ماجہ، باب الصلوٰۃ علی النبی

میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ اذا صلیتم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحسنوا الصلوٰۃ علیہ فانکم لا تدرون لعل ذالک یعرض علیہ۔ "تم لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو تو حسن و خوبی کے ساتھ بھیجو، تمہیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ تمہارا درود حضور کے سامنے پیش ہو۔" لوگوں نے عرض کیا "تو پھر وہ آپ ہمیں سکھا دیں۔" اس پر انہوں نے فرمایا کہ یوں کہا کرو: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلَوٰتَکَ وَرَحْمَتَکَ وَبَرَکَاتِکَ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ، اِمَامِ الْخَیْرِ وَقَائِدِ الْخَیْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَۃِ، اَللّٰھُمَّ ابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا یَغْبِطُہٗ بِہِ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ۔ "خدایا، اپنی عنایت و رحمت اور اپنی برکتیں نازل فرما رسولوں کے سردار، متقیوں کے پیشوا اور نبیوں کے خاتم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو تیرے بندے اور رسول ہیں، جو نیکی اور بھلائی کے امام و قائد اور رسولِ رحمت ہیں۔ خدایا اُن کو اُس مقامِ محمود پر پہنچا جس پر اولین و آخرین رشک کریں۔" اس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے درود کے وہ ماثور الفاظ پڑھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ ہیں۔

حضرت عبداللہؓ کے اس ارشاد کا صحیح مطلب اس مثال سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر کوئی شریف آدمی کسی کے ہاں جاتا ہے اور اس کے ملازم سے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے کہتا ہے تو اپنی زبان سے وہ خود یہ نہیں کہتا کہ صاحب خانہ سے کہو "مولانا عبدالرحمان صاحب تشریف لائے ہیں"، بلکہ وہ کہتا ہے "عبدالرحمان حاضر ہوا ہے"۔ اب یہ ملازم کی تمیز پر موقوف ہے کہ وہ صاحب خانہ کو اطلاع دینے کے لیے آنے والے کے مرتبے کے مطابق الفاظ استعمال کرتا ہے یا ٹھیک وہی الفاظ دہرا دیتا ہے جو آنے والے نے اپنے لیے استعمال کیے تھے۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کو حضرت اسود بن یزید نے روایت کیا ہے جو جلیل القدر تابعین میں سے تھے۔ اُن کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے کہ اُن کی ثقاہت کے لیے کسی کی سند لائی جائے۔ اُن سے اس کو روایت کرنے والے ابو فاختہ سعید بن علاقہ ہیں جنہیں حافظ ابن حجر نے تقریب میں ثقہ قرار دیا ہے۔ ان سے عون بن عبداللہؒ اس کے راوی ہیں جن کی ثقاہت پر امام احمد، یحییٰ بن معین، عجلی اور نسائی نے شہادت دی ہے۔ ان سے روایت کرنے والے المسعودی عبدالرحمان بن عبداللہ ہیں، اور یہی وہ راوی ہیں جن کو مخبوط الحواس قرار دے کر یہ روایت ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے قابل ٹھیرائی جاتی ہے حالانکہ علمائے رجال نے تصریح کی ہے کہ وہ ثقہ تھے اور صرف آخر عمر میں ان کا ذہن اُلجھ گیا تھا۔ امام احمد اور ابن عمار

کہتے ہیں کہ کوفے اور بصرے میں جو روایات لوگوں نے اُن سے سُنی ہیں وہ سب صحیح ہیں، البتہ بغداد جا کر ان کا ذہن پراگندہ ہو گیا تھا۔ ابن ابی حاتم اپنے والد ابو حاتم کا قول نقل کرتے ہیں کہ اپنی موت سے سال یا دو سال پہلے اُن کے ذہن کی یہ حالت ہوتی تھی۔ ابن مَعین کہتے ہیں کہ قاسم اور عون بن عبداللہ سے جو احادیث انہوں نے روایت کی ہیں وہ صحیح ہیں۔ ابن عُیَیْنَہ کہتے ہیں کہ میرے علم میں کوئی شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علم کو مسعودی سے بڑھ کر جاننے والا نہ تھا۔ علمائے رجال کی اس شہادت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح بے دردی کے ساتھ اُن احادیث کو اُٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے جو مفید مطلب نہیں ہوتیں۔

کیا واقعی حضورؐ نے اپنے لیے لفظ "سیّد" کے استعمال کو ممنوع قرار دیا تھا آپ کا یہ قول قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اپنے لیے سیّد کا لفظ استعمال کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا تھا۔ یہ احادیث کو نہ سمجھنے اور ان کے موقع و محل کو جانے بغیر اُن سے غلط نتائج نکالنے کی ایک واضح مثال ہے۔ اس معاملہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشامد، اور کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ بخاری اور ابو داؤد میں حضرت ابو بکرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ کے سامنے ایک اور شخص کی تعریف کی۔ آپ نے تین مرتبہ (اور دوسری روایت میں ہے بار بار) فرمایا "تو نے تو اپنے دوست کا گلا کاٹ دیا"۔ پھر سمجھایا کہ اگر تم میں سے کسی کو اپنے کسی بھائی کی مدح ضرور ہی کرنی ہو اور وہ واقعی اس کے متعلق وہی کچھ جانتا ہو جو وہ کہنا چاہتا ہے تو یوں کہے کہ "میں اُسے ایسا سمجھتا ہوں" اور ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ اس کو جاننے والا تو اصل میں اللہ ہے اور میں اللہ پر اُس کا تزکیہ لازم کرنے والا نہیں ہوں۔

یہ بات نگاہ میں رکھیے اور پھر اُس روایت کو دیکھیے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے لیے لفظ "سیّد" کے استعمال سے منع فرما دیا تھا۔ مسند احمد میں حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا سیدنا و ابن سیدنا، و خیرنا و ابن خیرنا۔ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، اے ہمارے سردار اور ہمارے سردار کے بیٹے، ہمارے بہترین شخص اور ہمارے بہترین شخص کے بیٹے"۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "لوگو، اپنے تقویٰ پر قائم رہو، شیطان تمہیں غلط راستے پر نہ ڈالنے پائے، میں محمد بن عبداللہ ہوں، اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اُس منزلت سے اوپر اُٹھانے کی کوشش کرو جو اللہ عزوجل نے مجھے عطا کی ہے"۔ اس کے ساتھ ہی وہ روایت بھی ملاحظہ فرما لیجیے جس کی بنا پر آپ لفظ سید کے استعمال سے منع کر دینے کی تاریخ ۹ھ

متعین فرما رہے ہیں مسند احمد میں تین جگہ اور ابو داؤد و کتاب الادب میں ایک جگہ یہ ذکر ہے کہ بنی عامر کا وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں مُطَرِّف بن عبداللہ بن الشِّخِّیر کے والد بھی شریک تھے۔ مطرف اپنے والد ہی کے حوالہ سے اُن کا یہ بیان روایت کرتے ہیں کہ ہم نے حاضر ہو کر آپؐ کو سلام کیا اور پھر کہا کہ آپ ہمارے ولی ہیں، آپ ہمارے سید (سردار) ہیں، آپ ہم پر سب سے زیادہ عطاء و بخشش کرنے والے اور فضل فرمانے والے اور بڑے عمدہ کھانے کھلانے والے ہیں۔" اُن کے اِس خوشامدانہ انداز کو دیکھ کر حضورؐ نے ان کے الفاظ اَنْتَ سَیِّدُنَا کے جواب میں فرمایا السیدُ اللّٰہُ تبارکَ وتعالیٰ۔ اور جب وہ خوشامد کیے ہی چلے گئے تو فرمایا "اپنی بات کہو اور شیطان تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال نہ کرے۔"

اِس کلام کو دلیل قرار دے کر یہ کہنا کہ حضورؐ نے اپنے لیے لفظ "سید" کے استعمال کو منع فرما دیا تھا، حدیث دانی اور حدیث فہمی کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ حضورؐ کے الفاظ السَّیِّدُ اللہ تبارک وتعالیٰ کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ اللہ کے سوا کسی کے لیے لفظ سید استعمال نہیں کیا جا سکتا، تو پھر اُن تمام احادیث کو غلط ٹھہرانا پڑے گا جن میں غیر اللہ کے لیے لفظ سید استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ اللہ جل شانہ کے اسمائے خاص میں لفظ السَّیِّد کا اضافہ کرنا پڑے گا، حالانکہ اسمائے الٰہی میں کسی نے بھی اس کو شمار نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب صرف یہ لیا جائے کہ اور سب کے لیے تو یہ لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے، البتہ حضورؐ کے لیے اس کا استعمال ممنوع ہے، تو یہ سراسر بے بنیاد معنی آفرینی ہو گی، کیونکہ جس فقرے کو آپ دلیل بنا رہے ہیں اس سے یہ مفہوم کسی طرح بھی نہیں نکلتا۔ علاوہ بریں یہ بات اس لیے بھی غلط ہے کہ جب خوشامد کے سوا کسی اور انداز میں حضورؐ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا تو آپ نے اس سے منع نہ فرمایا۔ چنانچہ مسند احمد میں نَضْلَہ بن طریف کی روایت ہے کہ اُن کے قبیلے کے ایک شخص عبداللہ کی بیوی ناشزہ ہو کر بھاگ گئی اور اُسی قبیلے کے ایک دوسرے شخص مُطَرِّف بن بَہصَل کے ہاں جا بیٹھی۔ عبداللہ نے جا کر اُس شخص سے اپنی بیوی کا مطالبہ کیا تو اُس نے انکار کر دیا۔ آخر کار وہ فریادی بن کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند اشعار کی صورت میں اپنی شکایت پیش کی۔ اُن میں سے پہلا شعر یہ تھا:

یا سیدَ الناس ودیّانَ العرب — الیک اشکو ذربة من الذرب

"اے لوگوں کے سردار اور عرب کے فرمانروا، آپ کے پاس میں بڑی زبان دراز عورتوں میں سے ایک کی شکایت پیش کرتا ہوں۔"

یہ چونکہ فریادی کی فریاد تھی نہ کہ کسی خوشامدی کی خوشامد، اس لیے اِن الفاظ پر حضورؐ نے کوئی اعتراض نہ فرمایا، بلکہ فوراً مطرف کے نام فرمان لکھا کہ اس شخص کی بیوی اِس کے حوالے کر دو۔[1]

بے سند اور غیر متعلق روایات سے استدلال | قاضی عیاض کی شفا سے آپ نے جو روایت نقل کی ہے، اُس کا کوئی حوالہ اُنہوں نے نہیں دیا ہے اور نہ اس روایت کی سند بیان کی ہے۔ عجیب بات ہے کہ مفید مطلب روایت تو بلا سند بلا حوالہ قبول، اور خلافِ مطلب روایت اگر صحاح ستہ میں سے ایک کے اندر پوری متصل سند کے ساتھ درج ہو تو اس کے ایک راوی پر بلا تحقیق تہمتیں جوڑ کر پوری حدیث رد۔ رہی آپ کی نقل کردہ وہ روایت جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتے کا سوال، اور حضرت جبریلؑ کے مشورے پر حضورؐ کا جواب نقل کیا گیا ہے تو وہ اس بحث میں سرے سے غیر متعلق ہے۔

حضورؐ کے ارشاد پر حضرت عمرؓ کا اعتراض! | آپ نے اِس مشہور واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ جب بنی قُریظہ کے معاملہ میں حَکَم کی حیثیت سے فیصلہ دینے کے لیے حضرت سعد بن مُعاذ بلائے گئے تھے تو حضورؐ نے حاضرین کو، یا انصار کو حکم دیا تھا کہ قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِ کُمْ۔ لیکن بخاری، مسلم، ابوداؤد، مسند احمد، اور مغازی و سیرت کی کتابوں میں اِس واقعے کی تمام دوسری روایات چھوڑ کر آپ کی نگاہ صرف مسند احمد کی اُس ایک روایت پر جا کر ٹھیری جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ کے یہ ارشاد فرماتے ہی کہ قوموا الی سیدکم (اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ) حضرت عمرؓ بھری مجلس میں بول اُٹھے کہ سَیِّدُنَا اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ (ہمارا سردار تو اللہ عزّ وجل ہے)۔ تھوڑی دیر کے لیے اِس بات سے قطع نظر کر لیجیے کہ دوسری روایتیں اِس ذکر سے خالی ہیں، آپ کی سمجھ میں یہ بات آ کیسے گئی کہ حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں یہ گستاخی کر سکتے تھے؟ اور وہ حضرت عمرؓ یہ بات کیسے کہہ سکتے تھے جن کا اپنا قول ترمذی میں حضرت عائشہؓ سے اِن الفاظ میں نقل ہوا ہے کہ ابوبکرٍ سیّدنا وخیرنا واحبّنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں، ہمارے بہترین آدمی ہیں، ہم سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہیں)۔ اور جن کا ایک دوسرا قول بخاری میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے یوں منقول ہوا ہے کہ ابوبکرٍ سیّدنا وَاَعْتَقَ

---

[1] یہ صاحب بنی حرمازیں سے تھے جو بنی مازن کے گھرانوں میں سے ایک گھرانا تھا۔ ان کا حضورؐ کو "دَیَّانُ العرب" کہہ کر خطاب کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس قبیلے کا قبولِ اسلام بھی فتح مکہ اور جنگ حنین کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا تھا جبکہ آپؐ واقعی عرب کے فرمانروا ہو گئے تھے۔

سَیِّدَنَا، یعنی بلالؓ (ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار، یعنی بلالؓ کو آزاد کیا ہے)۔

کیا حضورؐ کے لیے دُعا میں سیدنا کہنا روحِ دُعا کے خلاف ہے؟

آپ فرماتے ہیں کہ دُرود میں حضورؐ کے لیے سید کا لفظ استعمال کرنا روحِ دعا کے خلاف ہے، درخواست اور دُعا میں تو عبدیت اور عاجزی و انکساری کا اظہار ہونا چاہیے اور جس کے حق میں دُعا کرنی ہو اس کے لیے تو یوں کہنا چاہیے کہ ایک بندۂ مسکین آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے، نہ یہ کہ ہمارا آقا اور سردار حاضر ہو رہا ہے۔ آپ کی یہ بات اُس صورت میں تو بلاشبہ درست ہے جبکہ آدمی خود اپنے لیے دعا مانگ رہا ہو۔ مگر کیا یہ اُس صورت میں بھی صحیح ہے جبکہ آدمی کی دُعا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہو؟ کیا آپ حضورؐ کے حق میں دعا مانگتے ہوئے (معاذ اللہ) یوں کہیں گے کہ "یا اللہ بے چارے مسکین محمد رسول اللہ پر اپنی رحمتیں نازل فرما"؟ پھر آپ کی یہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے جبکہ مُسند احمد، مُسند ابوعوانہ، صحیح ابن حِبان اور حافظ مَرْوَزِی کی مُسندِ ابوبکر صدیقؓ میں صحیح سند کے ساتھ روزِ قیامت کی شفاعت کے متعلق یہ روایت آئی ہے کہ حضرت حُذَیفہؓ بن یَمان سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور ان سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اُس روز اللہ تعالیٰ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دُعا کا ایک ایسا طریقہ کھولے گا جو اس سے پہلے کسی بشر پر کبھی نہیں کھولا گیا، اور حضورؐ عرض کریں گے "اَیْ رَبِّ جَعَلْتَنِیْ سَیِّدَ وَلَدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ وَاَوَّلَ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا فَخْرَ" اے میرے ربّ تو نے مجھے سیدِ اولادِ آدم بنایا اور اس پر کوئی فخر نہیں، اور قیامت کے روز پہلا وہ شخص بنایا جس کے نکلنے کے لیے زمین شق ہوئی اور اس پر کوئی فخر نہیں"۔ دیکھیے یہاں خود اللہ تعالیٰ حضورؐ کو دُعا کا طریقہ سکھا رہا ہے، اور اس میں سید ولد آدم کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ کیا یہ روحِ دعا کے خلاف ہے؟

لفظ سید کی مشروعیت

آپ کے تمام اعتراضات کا جواب دینے کے بعد اب میں عرض کرتا ہوں کہ سید کا لفظ ایک مشروع لفظ ہے جو بکثرت احادیث میں حضورؐ کے لیے بھی اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

بخاری، مسلم، مسند احمد، مسند ابوداؤد طَیالِسی، ترمذی، ابوداؤد، دارمی اور دوسری کتبِ حدیث میں بکثرت سندوں کے ساتھ حضرات ابنِ عباس، ابوہریرہ، ابوسعید خدری اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم کی روایات آئی ہیں جن میں وہ حضورؐ کے یہ ارشادات نقل کرتے ہیں کہ اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا فَخْرَ، یا اَنَا سَیِّدُ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا فَخْرَ۔ ان میں سے بعض روایات میں یوم القیٰمۃ کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ صرف سید ولد آدم کے الفاظ ہیں۔

مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور مسند احمد میں یہ روایات آئی ہیں کہ لعان کے بارے میں جب حکم الٰہی کے نزول سے پہلے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ شوہر اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ ملوث دیکھ لے تو کیا کرے، اور اس موقع پر حضرت سعد بن عُبادہ نے غیر معمولی غیرت کا اظہار کیا، تو حضورؐ نے انصار کو خطاب کرکے فرمایا: اسمعوا الی ما یقول سید کم "سنو تمہارے یہ سردار کیا کہہ رہے ہیں" اسی طرح بخاری، مسلم، نسائی وغیرہ میں حضرت عائشہؓ سے اِفک کا جو قصّہ منقول ہوا ہے اس میں وہ حضرت سَعد بن عُبادہ کے لیے سیّد الخزرج کے الفاظ استعمال فرماتی ہیں۔ اور حضرت سعد بن مُعاذ کے لیے لفظ سیّد کے استعمال کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت اُبَیّ بن کعب کے لیے سیّدُ القرّاء کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں۔

مسلم، ابوداؤد اور مسند احمد وغیرہ میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ غلام اور لونڈیاں اپنے مالک اور مالکہ کو رَبِّی اور رَبَّتِی نہ کہیں بلکہ سیّدی اور سیّدتی کہا کریں۔

بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے سیّدۃُ نساءِ ھٰذہِ الاُمّۃ، سیّدۃُ نساءِ المومنین یا نساءِ المومنات اور سیّدۃُ نساءِ اھلِ الجنۃ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

بخاری، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اِبنِی ھٰذا سیّدٌ ولعل اللہ ان یُّصلح بہٖ بین فئتینِ من المسلمین (میرا یہ بیٹا سیّد ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے گا) - یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ دوسری روایتوں میں الفاظ کچھ مختلف ہیں، مگر حضرت حسنؓ کے لیے سیّد کا لفظ سب میں موجود ہے۔

حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے لیے سیّدا شبابِ اھل الجنۃ کے الفاظ ترمذی، ابن ماجہ، نسائی اور مسند احمد بن حنبل میں وارد ہوئے ہیں، اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے سیّدا کھولِ اھل الجنۃ کے الفاظ مختلف سندوں سے مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول ہیں۔

یہ تمام احادیث اس بات پر شاہد ہیں کہ سیّد کا لفظ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غیر مشروع ہے اور نہ دوسرے انسانوں کے لیے، اور وہ نہ اِس دنیا میں غیر مشروع ہے نہ آخرت میں۔ پھر نماز کے اندر یا خارج از نماز حضورؐ پر درود بھیجتے ہوئے اس کے استعمال کو کیسے ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

لفظ مولیٰ کی مشروعیت ایسا ہی معاملہ لفظ مولیٰ کا ہے۔ ابن ماجہ میں یہ روایت آئی ہے کہ کسی حج کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت معاویہؓ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت علیؓ کا ذکر برائی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس پر حضرت سعد غضب ناک ہوگئے اور انہوں نے فرمایا تقول ھٰذا الرجل سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ۔ "آپ یہ باتیں اُس شخص کے بارے میں کہہ رہے ہیں جس کے متعلق میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ "میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے"۔

مسند احمد اور نسائی میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ حضرت بُرَیدہؓ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ یمن کی مہم پر گیا اور وہاں مجھے ان سے سخت برتاؤ کا تجربہ ہوا۔ میں نے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ حضورؐ کا چہرۂ مبارک میری بات سن کر متغیر ہوگیا اور آپ نے فرمایا "اے بریدہ، کیا میں مومنوں کے لیے اُن کی جان سے بڑھ کر عزیز نہیں ہوں؟" میں نے عرض کیا "کیوں نہیں، یارسول اللہ"۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند عمدہ اور قوی ہے اور اس کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں۔

نسائی میں حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت نقل کی گئی ہے جس میں وہ حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "پھر آپ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، من کنت مولاہ فھٰذا ولیُّہٗ "جس کا میں مولا ہوں یہ بھی اس کا ولی ہے"۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ امام ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام احمد نے مُسند میں حضرت زیدؓ بن ارقم کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ حضورؐ نے وادیٔ خُم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا، "کیا تم نہیں جانتے، یا فرمایا کہ کیا تم اس کی شہادت نہیں دیتے کہ میں ہر مومن کے لیے اس کی جان سے بڑھ کر عزیز ہوں"؟ لوگوں نے عرض کیا ضرور۔ آپ نے فرمایا فمن کنت مولاہ فانّ علیًّا مولاہ۔ اور دوسری روایت میں ہے فعلیٌّ مولاہ۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ اسناد عمدہ ہے اور اس کے راوی سُنن کی شرط کے مطابق ثقہ ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ مولا کا لفظ بھی نبی اور غیر نبی، دونوں کے لیے غیر مشروع نہیں ہے۔ پھر اگر نماز کے اندر اور خارج از نماز، حضورؐ پر درود بھیجتے ہوئے سیدنا و مولانا کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو اس میں آخر گناہ کیا ہے؟ اور کس دلیل سے اس کو ممنوع یا ناجائز یا مکروہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

مطبوعات

آئینِ خداوندی	تالیف : جناب مظفر الدین صاحب
مع قولِ حق	ناشران : قرآن سوسائٹی (پاکستان)

قیمت : ۵/- روپے - صفحات آئینِ خداوندی ۱۸۹ - قولِ حق ۹۶

یہ ضروری نہیں کہ ایک غلط بات اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے بنیادی طور پر غلط ہی ہو بلکہ بسا اوقات جب کوئی صاحب دانش کسی نظامِ فکر میں سے کسی ایک بات کو الگ کر کے اور اس کے فطری توازن کو بدل کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ بات جو اپنے اصل مقام اور اپنے صحیح سیاق و سباق میں تو درست ہوتی ہے غلط ہو جاتی ہے۔ قریب قریب یہی معاملہ زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف کا ہے۔ انہوں نے قرآن کے نظامِ حیات کے بارے میں بعض باتیں بڑے خلوص کے ساتھ ارشاد فرمائی ہیں مگر ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے شدتِ جذبات میں اس نظام کے فطری توازن کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے بعض حصوں کو بڑے غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور اس طرح نظام کے مختلف اجزاء کے مابین قادرِ مطلق نے جو ایک خاص تناسب قائم کر رکھا ہے وہ درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر ص۱۵ پر فاضل مصنف علم اور وحی کا فرق اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ گویا وحی اور علم ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔ علم پڑھنا پڑھانا۔ وحی مجاہدہ و جہاد۔ علم دنیا کمانا وحی دارین کی عظمتیں۔ علم سے فربہ بدن وحی سے تازہ روح۔

مصنف کی اس پریشان فکری کے اثرات سے قرآن مجید کی آیات بھی نہیں بچ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے آیات کے جو تراجم کیے ہیں وہ بھی کافی حد تک محلِ نظر ہیں۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا وہ اس طرح ترجمہ کرتے ہیں: محمدؐ کا رستہ للّٰہیت کا رستہ ہے یہ اس اللہ کو پہنچاتا ہے جو کائنات و مافیہا کا رب (خالق رازق) ہے۔ وَکَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیْدًا۔ کائنات تو تمام کا تمام للّٰہیت کا نظام ہے اور اللہ کافروں سے غنی اور للّٰہیت والوں سے حمید ہے وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا۔ اور زمین کی کائنات ذرہ ذرہ للّٰہیت میں ہے (مجاہدہ مومن کے لیے اللہ وکیل کافی ہے)۔

فاضل مصنف کی یہ بات بھی تبصرہ نگار کے لیے موجبِ حیرت ہے کہ آئینِ خداوندی کا مصنف شاہ ایران اور شاہ افغانستان اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ کو اس آئین پر عمل کرنے والے خیال کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:- (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) وہ عملِ قومِ لوط کے متعلق اپنے ذاتی تجربات سے عوام کو آگاہ کریں۔ بُرائی کے اس چرچے نے باقاعدہ ایک مہم کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس کے زیرِ اثر آ کر بعض بڑے نامور لوگ خود اپنی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر ہارورڈ براؤن نیویارک یونیورسٹی کے شعبہ طب کے پروفیسر نے نمک مرچ لگا کر اپنے گھناؤنے تجربات بیان کیے ہیں۔ اس پروفیسر کے ساتھ سینٹ کے متعدد ارکان، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، کارخانہ دار اور اعلیٰ سرکاری افسر بھی اس مہم میں شریک ہیں اور وہ اپنے اس جرم کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں گویا کہ یہ کوئی بڑا قابلِ قدر کارنامہ تھا جو اُن کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے۔ اگر کوئی ادارہ اپنے کسی کارکن کی اس مذموم حرکت پر اُسے ٹوکتا ہے تو ادارے کے سارے ملازمین اس کے خلاف ہڑتال کر دیتے ہیں اور پلے کارڈ پر نہایت حیاسوز نعرے لکھ کر یہ آبرو باختہ لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور اپنے جرم کا پوری ڈھٹائی کے ساتھ اعلان کر کے اسے اپنی قوت کا مظہر خیال کرتے ہیں۔

(بقیہ مطبوعات)

"ایران میں آج شہنشاہ بنفسِ نفیس نوجوانوں کے ذریعہ ملک میں ایک ایسے انقلاب کی قیادت کر رہے ہیں جس کی ضرورت ساری دنیا محسوس کر رہی ہے۔ یہ تحریک آج کی دنیا میں عوام اور خصوصاً نوجوانوں کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ آگ اور خون نے سُرخ انقلابوں سے زیادہ نتیجہ خیز ایران کا وہ سفید انقلاب ہے جس کا محرک خود شہنشاہ کی ذات ہے۔"

کتاب میں جگہ جگہ ایسی عبارتیں موجود ہیں جو نظرِ ثانی کی محتاج ہیں مثلاً "اگر قرآنی تدبر سے موجودہ دیوالیہ پن کا احساس ہو جائے اور مسلمان کو پھر وحی کے سرچشمہ سے فکر آنے لگے۔" "نبی علیہ السلام اُمّی تھے۔ ان کی زندگی مکتب میں نہیں گزری۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری زندگی لائبریریوں میں گزرے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت دیکھیں تو اتباع کا ادنیٰ حصہ بھی پلّے میں نہ ہو۔" "یہ فکر اور ہنر کی صدی ہے تو فکر اور ہنر کے میدان میں آج شمال اپنی انقلابی دھار رکھتا ہے۔" عبارتوں میں ایسے انگریزی الفاظ کا بکثرت استعمال جن کے اُردو مترادفات موجود ہیں طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ تذکیر و تانیث کی غلطیوں کے علاوہ کتابت کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔

الجہاد فی الاسلام

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اوّلین تصنیف

— جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی

— جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔

— جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔

— اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانون صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔

— دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات

اور

بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ

— اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔

— جہاد کے مخالفین و معترضین کا مُسکت جواب

درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

چھ سو صفحات ——— قیمت ۲۲/۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور